# امیر و مأمور کا باہمی تعلق

## قرآن وسنت کی روشنی میں

☆


**ڈاکٹر اسرار احمد**

بانیٔ تنظیم اسلامی

و

**رحمت اللہ بُٹّر**

ناظم دعوت تنظیم اسلامی



شائع کردہ:

**شعبہ دعوت وتربیت**

**تنظیم اسلامی**

مرکزی دفتر: 67-A علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

www.tanzeem.org




## عرض ناشر

یہ بات ہر رفیقِ تنظیم کے لوحِ قلب پر نقش ہونی چاہئے کہ تنظیم اسلامی ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت ہے جو سب سے پہلے پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں اسلام کے عادلانہ نظام کے قیام کے لئے کوشاں ہے۔ چنانچہ تنظیم میں شامل ہونے والے ہر رفیق پر بحمداللہ یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے۔ اگر یہ بات اور دین کا جامع تصور واضح نہ ہو تو ایسا شخص تنظیم کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی اور جذبۂ عمل سے محروم رہے گا۔ ایک رفیق تنظیم پر سب سے پہلے یہ واضح ہونا چاہئے کہ اُس کے دین کے اُس سے کیا تقاضے ہیں اور اس کا رب اس سے کیا چاہتا ہے۔ چنانچہ جہاں ہر رفیق تنظیم پر عبادتِ رب، شہادت علی الناس اور اقامتِ دین جیسی اہم دینی اصطلاحات کے حوالے سے فرائض دینی کا تصور بالکل واضح ہونا ضروری ہے، وہیں اسے اقامتِ دین کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت میں امیر اور مأمورین کے حقوق وفرائض کے بارے میں قرآن وسنت کی راہنمائی کا شعور بھی لازمی طور پر حاصل ہونا چاہئے کہ یہ معاملہ ایک اسلامی تنظیم میں کلیدی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

یہ کتاب اسی مقصد کی خاطر مرتب کی گئی ہے اور اسے تنظیم اسلامی کے ملتزم رفقاء کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کے حصہ اول میں بانیٔ تنظیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کے چار دروسِ قرآنی شامل ہیں، جن میں امیر و مأمورین کے باہمی تعلق پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، جب کہ حصہ دوم اس موضوع پر احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے انتخاب پر مشتمل ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کاوش کو جملہ متعلقین کے لئے اپنی رضا کے حصول کا ذریعہ اور توشۂ آخرت بنائے۔ آمین!

رحمت اللہ بٹر

ناظم دعوت

# فہرست

## حصہ اول



## حصہ دوم





# 'اطاعتِ امر'

## بمقابلہ

# 'تنازع فی الامر'

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعدُ :

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝﴾

(النساء)

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ (الانفال)

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓي اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (آل عمران)

﴿يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ﴾

(آل عمران:١٥٤)

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ

وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا
الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪
وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ
ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾﴾ (النور)

''فرائضِ دینی کا جامع تصور'' کے ضمن میں ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرائض دینی کی چوٹی کیا ہے۔ اسے خواہ اقامت دین کہہ لیا جائے' خواہ تکبیر ربّ کہہ لیا جائے' خواہ غلبۂ دینِ حق یا اعلائے کلمۃ اللہ کہہ لیا جائے' خواہ زمین پر آسمانی بادشاہت کا قیام کہہ لیا جائے' خواہ قیامِ حکومت الٰہیہ کا نام دے دیا جائے' خواہ اسے قیامِ نظامِ اسلامی سے تعبیر کر لیا جائے' خواہ نفاذِ نظامِ مصطفیٰ ﷺ سے تعبیر کیا جائے' خواہ اسلامی انقلاب کہہ لیا جائے' یہ عبارات مختلف ہیں' اصطلاحات جدا ہیں' لیکن بات ایک ہی ہے۔

## قرآن وسنت کی روشنی میں سمع وطاعت کا تصور

ہم اس بات سے بھی بخوبی آگاہ ہیں کہ یہ کام بغیر ایک منظّم جماعت کے ممکن نہیں۔ یعنی صرف جماعت ہی نہیں بلکہ اس کے لیے ایک منظّم (disciplined) جماعت ناگزیر ہے۔ اس کے لیے قرآن وسنت کی اصطلاح ''سمع وطاعت'' ہے۔ یہ اصطلاح ہمارے منتخب نصاب نمبر 1 میں سورۃ التغابن کے آخر میں بایں الفاظ ذکر ہوئی ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنے امکان کی حد تک'' تاحدّ استطاعت۔ اللہ کا تقویٰ تو دین کی روح ہے۔ اور اس کا جو نظام بنے گا وہ ہوگا سمع وطاعت کا نظام کہ ''سنو اور بس اطاعت کرو۔'' اور اس کے لیے انفاق کی ضرورت ہے۔ یہ تینوں چیزیں سورۃ التغابن میں ایک ساتھ ذکر ہوئی ہیں کہ ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا﴾ ''اور (التزام



کے ساتھ) سنو اور (بلا چون و چرا) اطاعت کرو اور انفاق کرو''۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ انفاق دو طرح کا ہے' انفاقِ مال اور بذلِ نفس۔ یہ بات سورۃ الحدید کی ابتدائی آیات میں واضح ہو جاتی ہے۔ تو اب بات گویا پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی کہ روحِ دین اللہ کا تقویٰ ہے اور نظامِ دین سمع وطاعت ہے اور اس نظام کے تحت انفاقِ مال اور بذلِ نفس مطلوب ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو اِس حدیث نبویؐ میں مذکور ہے جو حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: التزامِ جماعت' سمع وطاعت' ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ''۔

اس حدیث میں جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے ان میں تیسری بات ''اطاعت'' ہے اور اس کے لیے جو نظام قرآن وسنت سے منصوص اور مأثور ہے اور جو ہماری پوری تاریخ میں معمول بہٖ رہا ہے وہ بیعت کا نظام ہے۔ ہر چھوٹی بڑی اجتماعیت اسی کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ ڈھیلی سے ڈھیلی اجتماعیت بھی جو خالص انفرادی اصلاح کے عنوان سے قائم ہوئی' وہ بھی بیعت کے عنوان سے قائم ہوئی' حکومت بنی تو بیعت کے تحت بنی' حکومت سے بغاوت کی نوبت آئی تو بیعت کی بنیاد پر آئی۔ ہماری پوری تاریخ میں یہی نظر آتا ہے' لہٰذا اس کا نظام' نظامِ بیعتِ سمع وطاعت ہے۔ یہ بیعتِ سمع وطاعت حضور ﷺ اور دیگر انبیاء ورُسل کے لیے مطلق' غیر مشروط اور غیر مقید ہے' لیکن حضور ﷺ کے بعد ہر شخص کے لیے' خواہ وہ خلافتِ راشدہ تھی خواہ بیعتِ ارشاد ہو' فی المعروف کی شرط کے ساتھ مقید ہے۔ اس کے سوا اس نظامِ اطاعت کے حوالے سے کوئی فرق نہیں۔ البتہ ایک اور پہلو سے اس میں ایک فرق ہے' جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے' تاکہ اس کی اہمیت بھی سامنے آ جائے اور اس کا صغریٰ کبریٰ بھی پورے طور سے واضح ہو جائے' اور اس طرح سے انشراحِ صدر ہو جائے۔

اس کے ضمن میں سب سے پہلی آیت جو ہم نے منتخب کی' وہ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾ ''اے اہل ایمان! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اُس کے رسول کی اور اپنے میں سے اصحابِ امر کی''۔ بیعت کے سلسلے میں حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی

متفق علیہ حدیث میں الفاظ آئے ہیں: ''وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ '' کہ ہم نہیں جھگڑیں گے اصحابِ امر سے' چاہے جو بھی امیر ہو۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ امارت کا ایک باقاعدہ سلسلہ ہوتا ہے۔ ایک ہی شخص امیر نہیں ہوتا۔ حضورﷺ مسلمانوں کے امیر مطلق تھے۔ پھر آپؐ کہیں کوئی جیش بھیجتے تھے تو کسی کو اس کا امیر بناتے تھے۔ پھر اس جیش میں بھی کوئی ایک امیر نہیں ہوتا تھا' اس کے تابع مختلف دستوں کے کمانڈر ہوتے تھے۔ یعنی کوئی میمنہ پر امیر ہے تو کوئی میسرہ پر' کوئی قلب پر امیر مقرر کیا گیا ہے تو کوئی ہراول دستے پر۔ اسی طرح کوئی پیچھے محفوظ فوجوں (Reserved Forces) پر امیر ہے۔ پھر فوج کے مختلف حصوں کی مزید تقسیم بھی ہو سکتی ہے۔ میمنہ اور میسرہ کے اندر بہت سے دستے اور ان کے الگ الگ کمانڈر ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ تو ایک سلسلہ ہے' اس لیے ''اولی الامر'' کو جمع کی صورت میں لایا گیا ہے۔

مزید نوٹ کیجیے کہ یہاں اطاعت کی جو تین کڑیاں ہیں' اللہ کی اطاعت' رسول کی اطاعت اور اولی الامر کی اطاعت' ان میں سے پہلی دو کڑیوں کے ساتھ تو فعل امر ''اَطِیْعُوْا'' کی تکرار ہوئی' لیکن تیسری کڑی کے ساتھ نہیں ہوئی۔ ورنہ عام ذہن چاہتا ہے کہ یا تو ایک ہی مرتبہ اَطِیْعُوْا کا لفظ کافی ہے' کیونکہ بریکٹ کے باہر والی قدر بریکٹ کے اندر موجود تمام اقدار سے ضرب کھاتی ہے۔ یا پھر اگر تکرار کی گئی تھی تو ایک لفظ کے اضافے سے کوئی حرج نہیں تھا کہ اولی الامر کے ساتھ بھی لفظ ''اَطِیْعُوْا'' دہرا دیا جاتا۔ لیکن نہیں' جو کچھ ہوا بالحق ہوا' اللہ کی حکمت کی بنیاد پر ہوا۔ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت تو مطلق ہے' جب کہ اولی الامر کی اطاعت مقید اور مشروط ہے اور پہلی دو اطاعتوں کے تابع ہے۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہیے جو اِن الفاظ کی ترکیب کے اندر مضمر اور مقدر (understood) ہے۔

اب ذرا توجہ کو لفظ اطاعت پر مرکوز کیجیے! اس کا مادہ ''طوع'' ہے اور طوع بمقابلہ ''کرہ'' کے آتا ہے' جیسے طوعاً و کرہاً عام مستعمل ہے۔ اطاعت کہتے ہیں دلی آمادگی سے کسی



کی بات ماننے کو۔ یہی اصل میں مطلوب ہے۔ اگرچہ حدیث میں جو بیعت کے الفاظ ہیں ان میں ساتھ ہی اضافہ کر دیا گیا کہ اگر بطوعِ خاطر ہے فبہا' ورنہ اگر کرہاً ہے تو بھی کرنی پڑے گی۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث کے الفاظ ہیں: بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَهِ...... [1]'' ہم نے بیعت کی تھی رسول اللہ ﷺ سے کہ ہم سمع و طاعت پر کاربند رہیں گے، چاہے مشکل ہو یا آسانی ہو، طبیعت کی آمادگی میں بھی اور ناگواری میں بھی......'' یعنی چاہے تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو' تمہارے بارِ خاطر ہو' تمہاری رائے اس کے حق میں نہ ہو' لیکن چونکہ فیصلہ ہو گیا ہے' صاحبِ امر نے طے کر دیا ہے اور آپ اسے خلافِ دین ہونا یا شریعت کے کسی واضح حکم کے مخالف ہونا بھی ثابت نہیں کر سکے تو آپ کو وہ فیصلہ ماننا پڑے گا۔ اگرچہ جماعتی نظم میں جو روح درکار ہے' جس سے کامیابی کی ضمانت ہو گی' وہ تو یہ ہے کہ جماعت کی اصل ریڑھ کی ہڈی کے اندر یہ اطاعت اپنی اصل روح کے ساتھ یعنی بطوعِ خاطر ہو رہی ہو۔

اب اس میں جو اصل بات ہے' جسے میں چاہتا ہوں کہ آپ پورے شرح و بسط کے ساتھ سمجھ لیں' وہ یہ ہے کہ اولی الامر کے ساتھ شرط ہے مِنْكُمْ کی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ اولی الامر مسلمان ہونے چاہئیں۔ اب اگر کہیں غیر مسلم زبردستی قابض ہو جائے تو مجبوراً اور اضطراراً تو اس کی اطاعت کی جا سکتی ہے' جیسے بھوک سے مرتا انسان سؤر یا مردار کھا سکتا ہے' جیسے فرمایا گیا: ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ﴾ (البقرۃ:۱۷۳) (پس جو حالت مجبوری میں ہو تو اس پر [یہ ناپاک چیز کھانے میں] کوئی گناہ نہیں' بشرطیکہ [اس کے کھانے میں] کوئی سرکشی اور حد سے تجاوز نہ ہو)۔ ورنہ اسلام میں اصلاً غیر مسلم کی اطاعت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اس اعتبار سے کراچی کا مقدمۂ بغاوت ہماری گزشتہ دو سوسالہ تاریخ کے اندر روشنی کا ایک عظیم مینار ہے' جہاں ہماری تین عظیم شخصیتوں نے انگریز کی عدالت میں برملا تسلیم کیا کہ ہاں ہم باغی ہیں اور مسلمان کسی غیر مسلم حکومت کا وفادار

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب کیف یبایع الامام الناس۔ وصحیح مسلم، کتاب الامارة، باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة وتحریمها فی المعصیة۔

نہیں ہے۔

## اولوالامر سے اختلاف کی صورت میں لائحہ عمل

اب آپ ایک بات اور سمجھئے کہ یہ نظامِ اطاعت دوطرح کا ممکن ہے۔ ان دونوں کے ضمن میں حکم ہو رہا ہے کہ: ﴿فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ﴾ یعنی اگر تم کسی چیز کے معاملے میں اختلافِ رائے کا شکار ہو جاؤ، تمہارے مابین کسی معاملے میں تنازُع ہو جائے تو اسے لوٹا دو اللہ اور اس کے رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔ اب دیکھئے تنازُع کسے کہتے ہیں۔ یہ نزع سے بابِ تفاعل ہے۔ نزع کے معنی ہیں کھینچنا۔ جب جان کھینچی جائے گی تو وہ عالمِ نزع ہے۔ لہٰذا تنازُع کے معنی ہیں کھینچ تان۔ اگر ایک طرف سے ایک کھینچ رہا ہے اور دوسری طرف سے کوئی دوسرا کھینچ رہا ہے تو یہ تفاعل کے وزن پر تنازُع ہے۔ بابِ مفاعلہ کی طرح بابِ تفاعل کے بھی دو خواص مبالغہ اور مشارکہ ہیں۔ یعنی شرکت بھی ہوتی ہے اور مبالغہ بھی ہوتا ہے۔

تو اس آیت میں اسی بات کی طرف راہنمائی کی جا رہی ہے کہ اگر تمہارے مابین یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو اب کیا کرنا ہے! یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کی رائے ہو کہ یہ چیز صحیح ہے اور دوسرے کی رائے ہو کہ نہیں، یہ غلط ہے۔ اب یہاں نوٹ کیجیے کہ میں نے 'صحیح' اور 'غلط' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ صحیح اور غلط کے مختلف درجات ہیں۔ ایک معاملہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کی رائے ہے کہ یہ چیز اَنسب ہے، زیادہ مناسب ہے اور ایک کی رائے ہے کہ یہ کم مناسب ہے۔ معاملہ نصوص کا نہ ہو، حلال و حرام کا نہ ہو، بلکہ صرف تدبیر کا ہو کہ بحالاتِ موجودہ ہمارے لیے کون سا طریقۂ کار موزوں تر ہے؟ ابھی ہم کوئی مزید قدم اٹھانے کی پوزیشن میں ہیں یا نہیں ہیں؟ ایک کا خیال ہو سکتا ہے کہ ہیں اور ایک کا خیال ہو سکتا ہے کہ نہیں ہیں۔ اس بحث کو ایک طرف رکھ دیجیے! یہاں معاملہ نصوص کا ہے۔ جو معاملات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مطلق اطاعت سے متعلق ہوں، یعنی حلال و حرام، جائز و ناجائز اور صحیح و غلط میں اگر



اختلافِ رائے ہو جائے اور تنازُع پیدا ہو جائے۔ یہاں وہ حدیث ذہن میں لے آئیے کہ ((اِنَّ الْحَلَالَ بَیِّنٌ وَاِنَّ الْحَرَامَ بَیِّنٌ وَبَیْنَھُمَا مُشْتَبِھَاتٌ))[1] ''حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، البتہ ان دونوں کے مابین کچھ چیزیں مشتبہ (غیر واضح) ہیں''۔ دین میں جو قطعی حلال و حرام ہیں وہ تو بالکل بیّن ہیں۔ البتہ ان کے مابین مشتبہات کا دائرہ آ جاتا ہے جہاں اصل میں مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ مشتبہات میں بھی آدمی کی رائے میں سختی ہو سکتی ہے۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ یہ چیز حرام سے زیادہ قریب ہے اور کسی دوسرے کی رائے میں یہی چیز حلال سے زیادہ قریب ہے تو دونوں اپنی اپنی رائے پر جازم ہو جائیں گے اور ان کی آراء میں سختی پیدا ہو جائے گی۔ اس کیفیت کو ذہن میں رکھئے! اس کا حکم یہ دیا کہ: ﴿فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ﴾ ''لوٹا دو اُس شے کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف''۔ یہ بالکل منطقی سی بات ہے۔ اس لیے کہ غیر مقید، غیر مشروط اور مطلق اطاعت تو صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہے۔

اب دیکھئے، نظمِ جماعت کی دو علیحدہ علیحدہ شکلیں ہیں، جنہیں سمجھ لینا چاہیے۔ ایک معاملہ ہو سکتا ہے کسی اسلامی ریاست میں حکومت کے ساتھ اس جھگڑے کے پیش آ جانے کا۔ ہم سورۃ الحجرات میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں کہ اسلامی ریاست کا اصل الاصول یہ آیۂ کریمہ ہے: ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ﴾ (آیت ۱) ''اے اہلِ ایمان! اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو!'' کیونکہ قرآن و سنت ہی اس کا دستورِ اساسی ہے اور اہلِ ایمان کے پاس جو بھی قانون سازی کا اختیار ہے وہ ایک دائرے کے اندر محدود ہے۔ چنانچہ پاکستان کے دستور میں بھی یہ شق موجود ہے کہ:

*"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."*

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ریاست کا ایک شہری اگر یہ محسوس کرتا ہے کہ جو مسودۂ قانون

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینہ۔ وصحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب اخذ الحلال وترک الشبہات۔

اس وقت زیر بحث ہے اس کی کوئی شق یا وہ پورا قانون شریعت کے دائرے سے تجاوز کر رہا ہے‘ یا یہ کہ جو قانون اس وقت ریاست میں موجود ہے‘ اس کی رائے کے مطابق (چاہے اس کی رائے صحیح ہو یا غلط) اس میں اللہ اور اس کے رسول کے دائرے سے تجاوز ہے‘ تو اس صورت میں اس کا کیا حل ہوگا؟ اس کی وضاحت تفصیلاً ہو چکی ہے کہ الحمد للہ‘ ثم الحمد للہ کہ اس دَور میں جو ادارے (institutions) وجود میں آئے ہیں اور جو عمرانی ارتقاء ہوا ہے اس نے ریاست کے تین بنیادی اعضاء (organs) کو علیحدہ علیحدہ متعارف کرایا ہے۔ ایک قانون ساز ادارہ (Legislature) ہے‘ ایک انتظامیہ (Executive) ہے اور ایک عدلیہ (Judiciary) ہے۔ تو یہ معاملہ عدالت کے حوالے ہوگا۔ جیسے دستور کی جو دوسری provisions ہیں‘ ان سب کی امین (custodian) عدلیہ ہے۔ مثلاً اگر کسی کے بنیادی حقوق میں کمی کی گئی ہے تو وہ کہاں جائیں گے! عدالت ہی کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ اسی طرح جب ریاست کے دستورِ اساسی میں یہ طے ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی تو اختلاف کی صورت میں آپ عدالت ہی کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ آپ کے خیال میں اگر کوئی عمل قرآن وسنت کے خلاف ہو رہا ہے‘ ممکن ہے آپ کو مغالطہ ہو‘ لیکن یہ کہ آپ کے لیے راستہ تو یہی ہے کہ جو بھی اعلیٰ عدالتیں ہیں ان کا دروازہ کھٹکھٹائیں! وہاں علماء کو بھی بحث اور استدلال کا موقع ہے کہ وہ عدالت میں جائیں اور دلائل دے کر ثابت کریں کہ یہ صرف مغالطہ تھا یا بات واقعی صحیح تھی۔ یہ ہے صورت جو اسلامی ریاست کے اندر اِس دَور میں اختیار کی جائے گی۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ نبی اکرمﷺ کے اندر تو دیگر ہزاروں حیثیتوں کے ساتھ یہ تینوں حیثیتیں بھی جمع تھیں۔ صدرِ ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ حضورﷺ ہی چیف جسٹس بھی تھے‘ حضورﷺ ہی چیف ایگزیکٹو بھی تھے اور قانون سازی بھی حضورﷺ ہی کے ہاتھ میں تھی۔ آپؐ تو خود شارع ہیں۔ شارع اوّل اللہ تعالیٰ اور شارع ثانی محمدٌ رسول اللہﷺ۔ تو یہ تینوں حیثیتیں حضورﷺ کی ذات میں جمع تھیں۔ اسی کا عکس آپ کو خلافت راشدہ میں نظر آئے گا‘ اگرچہ ذرا آگے چل کر اس میں تقسیم شروع ہوئی ہے۔



غالباً حضرت عمرؓ کے زمانے میں علیحدہ عدالتی نظام قائم ہوا ہے‘ ورنہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں کوئی علیحدہ عدالتی نظام نہیں تھا اور خلیفۂ وقت چیف جسٹس بھی تھا۔ ان چیزوں کے بارے میں لوگوں کو مغالطے لاحق ہو گئے ہیں۔ وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ کیفیت ہمیشہ کے لیے واجب العمل (binding) ہے اور وہ تمدنی ارتقاء کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں بڑے بڑے لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ نظامِ خلافت راشدہ دراصل نظامِ دورِ نبوت کا تتمہ اور اس کا عکس ہے اور یہ حیثیت آئندہ کسی بھی نظامِ حکومت کو حاصل نہیں ہو سکتی‘ اس لیے کہ حضورﷺ نے اس کے نظائر کو ہمارے لیے binding قرار دے دیا ہے۔ حضورﷺ کا فرمان ہے: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) (۱) ’’پس تم پر لازم ہے کہ میرا طریقہ اور ہدایت یافتہ خلفاءِ راشدین کا طریقہ اختیار کرو‘‘۔ اب کسی اعلیٰ سے اعلیٰ اسلامی حکومت کا بھی تا قیامِ قیامت یہ مقام نہیں ہوگا۔ خلافت راشدہ تو اصل میں تتمہ اور نمونہ ہے دورِ نبوت کا۔ بہرحال یہ اولی الامر کا معاملہ اس طور سے اسلامی ریاست میں حل ہوگا۔

نظم جماعت کی دوسری صورت ایک اسلامی جماعت کی ہے۔ بالفرض ریاست قائم نہیں ہے اور اس کے قیام کی جدوجہد کے لیے ایک جماعت قائم ہوئی ہے تو اس میں جو اولی الامر ہوں گے ان کے ساتھ معاملہ کس طور سے ہوگا؟ اب اس میں بھی دیکھئے کہ ایک تو وہ شخص ہے جس کے ہاتھ پر آپ نے بیعت کی ہے۔ وہ آپ کا امیرِ اوّل ہے‘ وہ داعیٔ اوّل ہے۔ اس نے پکارا ہے مَنْ اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ۔ آپ اس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے جمع ہو گئے۔ اس کے ہاتھ پر آپ نے بیعت سمع وطاعت فی المعروف کی ہے۔ اب اس کے نیچے امراء کا ایک نظام ہے اور امراء کی ایک لمبی زنجیر ہے۔ جتنی بڑی وہ جماعت ہوگی اور اس جماعت کا جتنا پھیلاؤ ہوگا اتنی ہی وہ لمبی زنجیر بنتی چلی جائے گی۔ اب یہاں پر اگر تدبیر کے معاملے میں آپ کا کوئی اختلاف ہوگا تو آپ صرف اپنی رائے پیش کر کے آزاد ہو جائیں

(۱) سنن ابن ماجه‘ المقدمة‘ باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين۔ و سنن ابی داوٗد‘ كتاب السنة‘ باب فی لزوم السنة۔

گے۔اب اس پر جو فیصلہ صاحب امر کرے گا آپ کو اسے تسلیم کرنا ہوگا' چاہے آپ اسے فِی الْمَنْشَطِ قبول کریں اور چاہے فِی الْمَکْرَہِ ۔اب یہاں تک تو کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو گا۔مسئلہ اس وقت پیدا ہوگا جب ایک شخص کا خیال ہو کہ یہ تو شریعت کی حدود سے تجاوز ہو رہا ہے۔اب اس صورت میں یہ ہوگا کہ اگر تو یہ زیریں اطاعتیں ہیں' یعنی اصحابِ امر امیر اوّل سے نیچے والے ہیں تو آپ کو ایک لائن آف اپیل میسر ہے۔آپ اس امیر سے بالاتر امیر کے پاس اپیل کریں گے۔اور اگر آپ کو اس سے بھی اختلاف ہے تو اس سے بالاتر کے پاس جائیں گے۔آپ کو through proper channel اس بات کو امیر اوّل تک پہنچانا ہوگا۔اس میں کوئی شخص اپنے آپ کو آخری فیصلہ کرنے والا متصور نہ کرے۔ فرض کیجیے کہ بات آخری امیر یعنی امیر اوّل تک پہنچ گئی اور آپ اس کی ذات سے بھی مطمئن نہیں ہوئے تو آپ کے لیے راستہ بالکل کھلا ہوگا کہ آپ اس سمع وطاعت کی بیعت کا قلادہ گردن سے نکال کر پھینک دیں۔

ریاست اور جماعت میں یہی بنیادی فرق ہے کہ ریاست کی علاقائی حد بندی (territorial jurisdiction) ہوتی ہے' آپ اس سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتے۔ یہاں جو بھی نظام قائم ہے آپ طوعاً یا کرہاً اس کے رکن ہیں' جب کہ جماعت کا کوئی علاقائی تسلط نہیں ہوتا۔آپ فوراً ہی جماعت سے الگ ہو سکتے ہیں۔اس کے لیے آپ کو نہ شہر اور گاؤں چھوڑنا پڑتا ہے اور نہ ملک چھوڑنا پڑتا ہے۔آپ نے جماعت کا ایک نظم اختیار کیا تھا جو ایک معنوی نظم ہے' علاقائی نظم نہیں ہے۔کسی شخص کی اصابتِ رائے پر آپ کو اعتماد ہوا تھا تو آپ فکری ہم آہنگی کی بنا پر جماعت میں شامل ہوئے تھے' کسی شخص کے خلوص واخلاص پر آپ کے دل نے گواہی دی تھی اور اُس کی عزیمت اور ہمت پر آپ کو اعتماد ہوا تھا تو آپ شامل ہوئے تھے۔اگر آپ کے نزدیک اب ان میں سے کوئی چیز نہیں رہی تو آپ کے لیے راستہ کھلا ہے' آپ آنِ واحد میں علیحدہ ہو سکتے ہیں۔یہ ہے اصل فرق جسے لوگ نہیں سمجھتے ۔یعنی ریاست کے ضمن میں فیصلے کے لیے عدلیہ سے رجوع کیا جائے گا۔اور جماعت میں امکان بھر کوشش کیجیے کہ اس بات کو معین طریق کار کے ذریعے آگے تک پہنچائیے! لیکن



بہرحال کہیں نہ کہیں جا کر تو بات رُکے گی! کہیں پر جا کر تو وہ زنجیر بند ہوگی اور بات آخری امیر تک پہنچے گی! لہٰذا وہاں جا کر آدمی کو فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اگر اس کا دل مطمئن نہیں ہے تو وہ کیسے چل سکتا ہے! تدبیر کے معاملے میں اگر دل مطمئن نہیں ہے تو اس کو چلنا چاہیے۔لیکن اگر نصوص کے بارے میں دل مطمئن نہیں رہا تو اب اس کا چلنا ضروری نہیں ہے۔وہ اس اطاعت کے قلادے کو اتار پھینکے۔اس کے لیے یہ راستہ کھلا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا:﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾﴾ ''یہی بہتر ہے اور انجام کار کے اعتبار سے صحیح طریقہ ہے''۔اس میں لفظ ''تاویل'' کا مفہوم سمجھ لیجیے۔ اٰلَ' یَؤُوْلُ کا مطلب ہے کسی چیز' کسی مرکز کی طرف لوٹنا۔اسی سے لفظ آل بنا ہے جس میں ایسے تمام لوگ ہوتے ہیں جو کسی بڑی شخصیت کی طرف اپنی نسبت کریں' اپنے آپ کو اس سے جوڑیں' اس سے تعلق قائم کریں' کسی معاملے میں اس کی طرف رجوع کریں۔وہ سب گویا اس کی آل ہیں۔اس معنی میں ''آلِ محمدؐ'' پوری اُمت ہے۔جو بھی حقیقت کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جڑا ہوا ہے وہ آپ ﷺ کی آل میں شامل ہے۔تو اٰلَ' یَؤُوْلُ کے باب تفعیل میں تاویل بنا ہے جس کے معنی ہیں لوٹانا' کسی چیز کو رجوع کرانا۔یعنی اگر اپنی جدوجہد کو کامیابی اور نتیجہ خیزی کی طرف لوٹانا چاہتے ہو تو اس کا یہ راستہ ہے' جو بہت بہتر اور سب سے عمدہ اور خوبصورت شکل ہے لوٹنے کی اور اپنے معاملے کو لوٹانے کی۔کیونکہ آیت میں الفاظ آئے ہیں:﴿ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ﴾ تو یہ اس کی ظاہری شکل اور کامیابی کی طرف لوٹنا ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی بیعت کی متفق علیہ حدیث کی ایک روایت میں: '' وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ '' کے بعد ان الفاظ کا اضافہ ہے: ''اِلَّآ اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ ''[1]۔یہ الفاظ حضور ﷺ نے ارشاد فرمائے ہوں گے' اس لیے کہ یہاں صیغہ بدل گیا ہے۔ان الفاظ میں حضور ﷺ نے گویا ایک مضمر شے کو نمایاں فرمایا: ''سوائے اس کے کہ تم کھلم کھلا کفر کا مشاہدہ کرو جس کے ضمن میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے برہان ہو (دلیل اور سند ہو)''۔کوئی بھی محض اپنے ذاتی خیال اور

وجدان کی بنیاد پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں حدودِ شریعت سے تجاوز ہو رہا ہے' بلکہ یہاں تو واضح دلیل اور سند کی ضرورت ہے۔ ورنہ تو نظم کہاں رہا! پھر تو سمع وطاعت کی روح غائب ہو گئی! سمع وطاعت کے پورے نظام کی چولیں ہل جائیں گی۔

## تنازُع کی ممانعت اور اس کے ممکنہ نتائج

اب آگے چلیے! سورۃ الانفال (آیت ۴۶) میں فرمایا: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی''۔ اب یہاں اَطِیْعُوْا کا لفظ رسول کے ساتھ بھی دہرا کر نہیں لایا گیا۔ اس لیے کہ الفاظ کے استعمال میں بھی قرآن مجید میں لفاظی نہیں ہے' کم سے کم جچے تلے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہاں چونکہ امراء کے اِس سلسلے کو نمایاں کرنا اور اس میں فرق وتفاوت کو واضح کرنا مقصود نہیں تھا' لہٰذا ایک ہی بار ''اَطِیْعُوْا'' لایا گیا۔ اور قرآن میں ہمیشہ ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ'' ہی آتا ہے کہ ''اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو''۔

رسول اللہ ﷺ کی جملہ حیثیتوں میں ایک حیثیت مدنی دَور میں یہ بھی تھی کہ آپ ﷺ حاکم یعنی چیف ایگزیکٹو اور چیف جسٹس بھی تھے اور قانون سازی کا سارا اختیار بھی آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھا۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے کچھ چیزیں حرام کی ہیں اور میں نے بھی کچھ چیزیں حرام کی ہیں۔ یہاں میں آپ ﷺ کی جس حیثیت کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں وہ قبل از ہجرت کی حیثیت ہے۔ اس وقت مَکّہ میں آپؐ کی حکومت نہیں تھی' کوئی علاقائی تسلط آپؐ کو حاصل نہیں تھا۔ مَکّے میں تو آپ ﷺ مغلوب تھے' کمزور تھے۔ اگرچہ بظاہر الفاظ مناسب نہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ کفر کو غلبہ حاصل تھا' کفار ومشرکین کے ہاتھ میں اختیار تھا' صحابہ کرامؓ کو اذیتیں دی جا رہی تھیں اور ان کی دادرسی کا بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس حالت میں تو دراصل مسلمان ایک جماعت تھے' جس کے امیر محمدؐ رسول اللہ ﷺ تھے۔ رسول ہونے کی حیثیت تو بلاشبہ تمام حیثیتوں سے بالاتر ہے۔ اسی لیے اس حیثیت کو قرآن میں نمایاں کیا گیا ہے جو سب سے اعلیٰ' سب سے اہم اور سب سے بلند ہے۔ لیکن سیرت



النبیؐ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر جگہ پر دیکھئے کہ حضور ﷺ کس حیثیت سے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ کہیں آپؐ صرف منصف کی حیثیت سے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ رسول کی حیثیت سے تو آپؐ سے خطا کا کوئی امکان نہیں ہے' لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ منصف کی حیثیت سے مجھ سے خطا ہو سکتی ہے۔ ایک حدیث کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ لوگو! تم میرے پاس اپنے مقدمات لے کر آتے ہو' کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق زیادہ چرب زبان ہے' اپنی بات کو دلیل کے ساتھ زیادہ زوردار انداز میں پیش کر سکتا ہے' جبکہ دوسرا بیچارہ اس پہلو سے عاجز ہے' تو وہ چرب زبان مجھ سے غلط فیصلہ کروا لیتا ہے۔ تو جان لو کہ میری عدالت سے بھی اگر تم کوئی غلط ڈگری لے گئے اور کسی زمین کے ٹکڑے کے بارے میں تم نے غلط فیصلہ حاصل کر لیا تو جان لو کہ وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہو گا جو تم لے کر جاؤ گے۔ کس قدر واضح حدیث ہے کہ بحیثیت منصف خطا ہو سکتی ہے۔ وہ تو صرف رسول کی حیثیت ہے جو خطا سے پاک ہے' منزہ ہے' معصوم ہے۔

غزوۂ بدر میں رسول اللہ ﷺ نے ایک مقام بتایا کہ یہاں پڑاؤ کیا جائے۔ صحابہؓ نے کہا کہ حضورؐ! اگر تو یہ وحی کا فیصلہ ہے' یہ آپؐ کا بحیثیت رسول امر ہے تو سرِ تسلیم خم ہے' ہماری عقلیں وحی کے مقابلے میں عاجز ہیں' ناقابل التفات ہیں۔ لیکن اگر معاملہ یہ نہیں ہے تو اجازت دیجیے کہ ہم عرض کریں! جب اجازت مل گئی تو صحابہ نے عرض کیا کہ حضورؐ! جنگی مہارت اور جنگی علم وفہم کے اعتبار سے ہم عرض کر رہے ہیں کہ یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے اسے تسلیم کر لیا اور پڑاؤ وہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ ڈالا جہاں صحابہؓ نے مشورہ دیا تھا۔ تو اگر ان تمام حیثیتوں کو علیحدہ علیحدہ نہیں رکھا جاتا تو آدمی مغالطے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تو یہاں فرمایا: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور جھگڑا مت کرو''۔ اب یہاں لفظ تنازُع آ گیا کہ جھگڑا مت کرو' کھینچ تان مت کرو۔ اگر یہ کرو گے تو کیا ہو گا؟ ﴿فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ﴾ ''تو تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی''۔ 'فَشَلَ' کا مطلب ہے کسی چیز کا ڈھیلا پڑ جانا۔ میں نے ''کسا ہوا نظم'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اس کے مقابلے میں ''ڈھیلا نظم'' ہے۔

یعنی اب اس کا چاک و چوبند والا معاملہ نہیں رہا۔ بعض تراجم میں ''فَتَفۡشَلُوۡا'' کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ ''تم نامرد ہو جاؤ گے''۔ اس لفظ کی اس حوالے سے بڑی مناسبت ہے۔ یہاں نظم کا ڈھیلا پڑنا مراد ہے جس کی طرف یہاں اشارہ ہو رہا ہے کہ اگر تم نے کھینچ تان شروع کر دی' اگر یہ تمہاری عادتِ ثانیہ بن گئی تو تمہاری ہمت ختم ہو جائے گی' تم پر نامردی سوار ہو جائے گی اور تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے۔ اور اس کا ایک اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ ﴿ وَتَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ ﴾ ''اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی''۔ یعنی کفار و مشرکین پر سے تمہاری دھاک ختم ہو جائے گی' تمہارا رعب اور دبدبہ ختم ہو جائے گا۔ یہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا نتیجہ نکل رہا ہے۔ یہ گویا کہ اب اس تنازُع کی منفی کیفیت ہے جس سے یہ نتائج رونما ہوں گے۔ اور یہ جان لو کہ اصل میں جماعتی نظم کا ڈھیلا پڑنا اس مقصد کو نقصان پہنچانے کا سبب بن جائے گا جس کے لیے جماعت قائم ہوئی تھی۔ جماعت تو کسی مقصد کے لیے قائم ہوتی ہے۔ جماعت بذاتہٖ تو مطلوب نہیں ہے۔ وہ فی نفسہٖ مطلوب شے نہیں ہے' کسی مقصد کے لیے ہے۔ تو تمہارا ڈھیلا پڑ جانا اور تمہاری ہوا کا اکھڑ جانا' اس کا نقصان اس مقصدِ عظیم کو پہنچے گا جس کے لیے تم نے وہ اجتماعیت اختیار کی اور اسے قائم کیا۔

آگے فرمایا: ﴿ وَاصۡبِرُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ۝۴۶ ﴾ ''اور صبر کرو (ڈٹے رہو' جمے رہو)' یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ اس میں صبر کا ایک پہلو اور بھی ہے کہ اطاعت امر کے لیے صبر کی ضرورت ہے۔ ایک صبر ہے مخالفین کے مقابلے میں ڈٹے رہنا اور ایک صبر ہے ایذاء پر۔ لیکن **صبر علی الطاعۃ** اور **صبر عن المعصیۃ** بھی تو صبر کی قسمیں ہیں۔ معصیت اور نافرمانی سے اپنے آپ کو روکنا بھی تو صبر ہے اور اطاعت پر کاربند رہنا بھی صبر ہے۔ اس **صبر علی الطاعۃ** اور **صبر عن المعصیۃ** کے لیے بھی وہی chain ہو گی' یعنی اللہ کی اطاعت پر صبر اور اللہ کی معصیت سے صبر' رسول کی اطاعت پر صبر اور رسول کی نافرمانی سے صبر' اسی طرح اولی الامر کی اطاعت پر صبر اور اولی الامر کی نافرمانی سے صبر۔ ایک چیز سے اپنے آپ کو روکنا صبر ہے اور ایک چیز پر اپنے آپ کو جمانا صبر ہے۔ چنانچہ یہاں دراصل اطاعت پر صبر کا حکم ہے۔ اور اطاعت میں وہی تین کڑیاں



پیشِ نظر رہیں گی: ﴿ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی' اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی''۔ اگرچہ لفظ ''صبر'' عام ہے لیکن درحقیقت یہ اسی **صبر علی الطاعۃ** کی طرف اشارہ ہے۔ اور اسی کی منفی شکل ہے **صبر عن المعصیۃ**۔ اطاعت اور معصیت پر صبر کا اوّلین استحقاق اللہ کا ہے' اس کے بعد رسول ﷺ کا اور پھر تیسرے درجے میں آتے ہیں وہ صاحب امر جو اہل ایمان میں سے ہوں۔

## غزوۂ اُحد میں تنازُع فی الامر کا نتیجہ

اب اگر اس آیت کے ساتھ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۵۲ کو جوڑ لیا جائے تو مضمون نکھر کر سامنے آ جائے گا۔ یوں سمجھئے کہ غزوۂ اُحد کا واقعہ مذکورہ بالا آیت کی ایک مثال ہے۔ یہ اس درس میں بہت اہم آیت ہے۔ یہاں غزوۂ اُحد کے حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو بڑی زک پہنچی' شدید نقصان ہوا' ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے' حضور ﷺ خود مجروح ہوئے' آپ ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے' چہرۂ مبارک لہولہان ہوا۔ ''فَتَفۡشَلُوۡا'' والی بات بھی ہوئی اور ''وَتَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ'' کا نقشہ بھی سامنے آیا۔ یہ سارے نتائج نکلے ہیں۔ لہٰذا ایک عملی مثال سے اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ سمجھ لیا جائے! اب اللہ تعالیٰ تبصرہ فرما رہے ہیں کہ اے مسلمانو! ذرا غور کرو' ذرا نگاہِ بازگشت ڈالو اور سوچو کہ ایسا کیوں ہوا۔ کیا ہم نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا تھا؟ کیا ہمارا نصرت کا وعدہ غلط تھا؟ کیا ہمیں کافروں سے محبت ہو گئی تھی؟ کیا ہم نے تمہارے مقابلے میں اُن سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا؟ کیا تمہیں ہم نے وَداع کر دیا تھا؟ تم سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا؟ 'وَداع' کا لفظ جو میں نے استعمال کیا ہے اس کا تعلق سورۃ الضحیٰ سے ہے' جس میں آپ ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے: ﴿ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝۳ ﴾ ''آپ کے ربّ نے نہ آپ کو چھوڑا نہ وہ آپ سے ناراض ہوا''۔ وہ ابتدائی مکی دَور ہے' اس میں صیغۂ واحد میں گفتگو ہو رہی ہے۔ یہاں یہی سمجھئے کہ ''مَا وَدَّعَكُمۡ رَبُّكُمۡ'' کہ تمہارے ربّ نے تمہیں چھوڑا نہیں ہے۔ تمہارا ربّ تم

سے کنارہ کش نہیں ہوا۔ اس میں سے کوئی چیز نہیں ہوئی۔ تو اب سمجھو کہ ہوا کیا ہے؟

فرمایا جا رہا ہے: ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ﴾ ”اور اللہ نے تو تم سے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا جب کہ تم انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے اللہ کے حکم سے“۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ ذہن میں رہے کہ تم سے وعدہ خلافی نہیں ہوئی ہے۔ ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿٨٧﴾﴾ (النساء) ”اللہ سے بڑھ کر سچی بات کرنے والا کون ہے؟“ اور: ﴿وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:۱۱۱) ”اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا وفا کرنے والا کون ہوگا؟“ تو وعدہ خلافی تو قطعاً نہیں ہوئی' بلکہ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ اہل ایمان کو پہلے ہی ریلے میں فتح حاصل ہو گئی تھی۔ کفار بڑے لاؤ لشکر اور سامان کے ساتھ آئے تھے۔ کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کی نسبت پہلے ہی ایک اور تین کی تھی اور اب منافقین کے واپس چلے جانے کے بعد ایک اور چار کی ہو چکی تھی' اس کے باوجود اللہ کا وعدہ صد فیصد درست ثابت ہوا' لیکن یہ واضح فتح شکست میں کیوں بدلی' اس کو ذرا سمجھو! فرمایا: ﴿حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ﴾ ”یہاں تک کہ جب تم ڈھیلے پڑے (تم نے نظم کو ڈھیلا کر دیا) اور تم نے امر میں جھگڑا کیا (کھینچ تان کی)“۔ اب دیکھئے سورۃ الانفال کی آیت ۴۶ والے الفاظ ہی یہاں آ رہے ہیں۔ یہ بہت اہم الفاظ ہیں۔ میں نے اسی لیے وضاحت میں ”نظم کو ڈھیلا کرنا“ اور ”تنازُع“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں' تاکہ ایک شے کی حقیقت کھل کر سامنے آئے۔ اسے فقہ اللغۃ کہتے ہیں کہ لغت کے اندر بصیرت کا حاصل ہو جانا۔ یعنی ایک لفظ کا مفہوم' اس کی مراد' اس کے مجازی معنی اور اس کے حقیقی معنی کو سمجھنا۔ ہر لفظ کا ایک باطن ہوتا ہے' اسے سمجھ لینے سے بصیرتِ باطنی پیدا ہوتی ہے۔

یہاں یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ سورۃ الانفال غزوۂ بدر کے بعد اور غزوۂ اُحد سے پہلے نازل ہوئی ہے جس کی آیت ۴۶ کا ہم نے مطالعہ کیا ہے۔ وہاں مسلمانوں کو پیشگی حکم دیا گیا تھا کہ: ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا﴾ ”اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی اور جھگڑا مت کرو!“ اور پیشگی تنبیہہ بھی کر دی گئی تھی: ﴿فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ﴾ ”ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی“۔ یعنی ایسا بھی نہیں ہوا



کہ پیشگی متنبہ نہ کیا گیا ہو۔ لیکن پھر تم نے (غزوۂ اُحد کے موقع پر) نظم کو ڈھیلا کیا اور امر میں جھگڑا کیا' کھینچ تان کی۔ یہ کس کا امر تھا جس میں جھگڑا ہوا اور کھینچ تان ہوئی؟ اسے بھی تنقیح کے ساتھ سمجھ لیجیے۔ اصلاً تو امر محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا تھا جو اُس وقت سپہ سالارِ اعلیٰ ہیں۔ یہ کوئی نص کا معاملہ نہیں تھا' بلکہ تدبیر سے متعلق معاملہ تھا کہ اس درّے سے یہ پچاس تیر انداز ہرگز نہ ہٹیں۔ لیکن اپنی بات کی تاکید کے لیے حضور ﷺ کی زبان مبارک سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے کہ ”خواہ تم یہ دیکھو کہ ہم سب شہید ہو گئے ہیں اور پرندے ہماری بوٹیاں نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم یہاں سے مت ہٹنا“۔ یہ انتہائی تاکیدی الفاظ ہیں۔ اب وہاں پچاس افراد ہیں اور ان کا ایک کمانڈر ہے۔ اب صورتِ واقعہ یہ ہے کہ رسولؐ وہاں موجود نہیں ہیں۔ اب صورت یہ ہوئی کہ فتح ہو گئی۔ اب تأویل کا اختلاف ہو گیا۔ اکثر تیر اندازوں نے کہا کہ اب تو فتح ہو گئی' کس لیے یہاں کھڑے ہو' چلو یہاں سے! جبکہ ان کا کمانڈر انہیں روک رہا ہے کہ دیکھو' رسول اللہ ﷺ کے حکم کو یاد کرو۔ لیکن ان کا موقف یہ تھا کہ وہ حکم تو اُس وقت تھا اگر شکست ہوتی' سب مارے جاتے' سب شہید ہو جاتے۔ اب تو فتح ہو گئی ہے' یہ حکم اب یہاں پر نافذ نہیں ہو رہا ہے۔ اب پہلے درجے میں یہ دیکھئے کہ یہ نص کا نہیں' بلکہ تدبیر کا معاملہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس تدبیر کے معاملے میں بھی معصیتِ صریحہ نہیں ہے' بلکہ تأویل ہے۔ اس تأویل کی وہ مثال بھی ذہن میں رکھئے گا کہ ”عصر کی نماز نہ پڑھنا جب تک بنو قریظہ کے ہاں نہ پہنچ جاؤ“۔ اس کی دونوں تأویلیں ہوئیں۔ ایک تأویل یہ ہوئی کہ عصر کی نماز سے پہلے پہلے بنو قریظہ تک پہنچنا لازمی ہے اور دوسری یہ کہ بنو قریظہ کے ہاں پہنچ کر ہی عصر کی نماز پڑھنی ہے۔ اور دونوں کو حضور ﷺ نے مساوی قرار دیا۔ تو یہ تأویل کی بات ہے۔ لیکن اب تیسرے درجے پر آیئے! اگر کمانڈر یہ تأویل قبول کر لیتا تو یہ تأویل کی بات ہو جاتی' لیکن کمانڈر نے قبول نہیں کی تو اب لازماً کمانڈر کا حکم چلے گا۔ یہاں معاملہ نظم کا ہے۔ جسے امیر بنایا گیا تھا تأویل تو اس کی چلنی تھی نہ کہ مأمورین کی۔ لہٰذا معصیت ہوئی تو اس کمانڈر کی۔

یہاں میں نے معاملے کو کتنا dilute کر دیا۔ یہاں معاذ اللہ' اللہ کے حکم کی یا

رسول ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ یہاں معاملہ نصوص کا نہیں' تدبیر کا ہے اور تدبیر میں بھی کھلم کھلا سرتابی نہیں ہے' بلکہ تاویل ہے۔ تاویل اگر کمانڈر کی ہوتی تو یہ غلطی نظر انداز ہو جاتی۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نظر انداز فرما دیتا۔ لیکن وہاں نظم ٹوٹا ہے' کمانڈر کا حکم نہیں مانا گیا اور ۳۵ تیر انداز وہاں سے چلے گئے' ۱۵ رہ گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اصلاً مطلوب یہ ہے کہ اس کا تجزیہ کر کے' تنقیح کر کے اچھی طرح سمجھ لیجیے۔

## مؤمن کا نصب العین۔ رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی

آگے فرمایا: ﴿وَعَصَيْتُمْ﴾ ''اور تم نے نافرمانی کی''۔ میں صراحت کر چکا ہوں کہ نافرمانی اللہ اور اس کے رسول کی نہیں' بلکہ کمانڈر کی ہوئی ہے جس پر گرفت کی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ بیعت میں یہ بھی کہا گیا ہے: اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ ''کہ ہم اصحاب امر سے نہیں جھگڑیں گے (کھینچ تان نہیں کریں گے)''۔ اب گویا تم نے اس میں معصیت کی ﴿مِنْ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ﴾ ''اس کے بعد کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھا دی جو تمہیں پسند ہے''۔ عام طور پر لوگ اس بارے میں مغالطے میں مبتلا ہیں کہ اس سے مراد مالِ غنیمت ہے۔ یہ مالِ غنیمت والی بات تو بالکل ہی غلط ہے۔ اس لیے کہ مالِ غنیمت کا مسئلہ اُس وقت تو ہو سکتا تھا اگر غزوۂ بدر کی بات ہوتی' جبکہ ابھی مالِ غنیمت کی تقسیم کا قانون نہیں آیا تھا۔ اُس وقت تک یہ روایت تھی کہ جو بھی شخص جتنا مال بھی جمع کر لے گا وہ اسی کا ہے۔ تو ہر شخص کے اندر خود بخود ایک طلب (urge) پیدا ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کر لے۔ اس صورتِ حال میں کوئی شخص سوچ سکتا تھا کہ ہم یہاں کھڑے رہ گئے تو ہمارے ہاتھ پلے کچھ پڑے گا نہیں۔ لیکن سورۃ الانفال میں مالِ غنیمت کا حکم تو بیان ہو چکا تھا اور حضور ﷺ اس پر عمل کر چکے تھے۔ مالِ غنیمت کے بارے میں حکم یہ تھا کہ سارا مال جمع ہو گا' اس کا پانچواں حصہ بیت المال کا ہو گا اور بقیہ سارا مال مجاہدین میں مساوی تقسیم کیا جائے گا۔ اور اس تقسیم میں بھی فرق یہ ہو گا کہ پیدل کے لیے اکہرا اور سوار کے لیے دوہرا حصہ ہو



گا' چاہے کوئی پہرے پر ہی کھڑا رہا ہو اور اس نے تلوار اٹھائی ہی نہ ہو۔ بلکہ حضور ﷺ نے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بھی حصہ لگایا اگرچہ وہ وہاں شریک بھی نہیں تھے' کیونکہ وہ حضور ﷺ کے حکم سے مدینہ منورہ میں رہ گئے تھے۔ لہٰذا اُن کو بھی اس غزوہ میں شریک فرض کیا گیا۔

تو جب یہ قانون آ چکا تھا تو کسی کو کیا ضرورت تھی کہ وہاں جاتا کہ مال جمع کرے؟ اس خیالِ خام کو ذہن سے نکال دیجیے۔ اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بڑا سوءِ ظن پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ یہ تو ابھی سن ۳ ہجری کا واقعہ ہے اور اس میں تمام سابقون الاوّلون شریک ہیں۔ اس میں تو منافقین شریک بھی نہیں ہوئے تھے' بلکہ عبداللہ بن اُبی کے ساتھ میدان چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ یہ سن ۱۰ یا ۱۱ کی بات ہوتی تو کسی قدر قابلِ التفات ہوتی کہ اب تو بہت کچے پکے لوگ بھی مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے۔ جبکہ یہ تو خالص لوگ تھے۔ ان سے یہ سوءِ ظن بہت بڑی غلطی ہے جن لوگوں کے ذریعے سے بھی پھیلی ہے۔ اصل بات کیا تھی؟ سورۃ الصّف کی آیت ۱۳ سے یہ بات کھل رہی ہے' جہاں فرمایا: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ﴾ ''ایک اور چیز جو تمہیں پسند ہے' (یعنی) اللہ کی طرف سے مدد اور فتح جو قریب ہے''۔ یہ فتح کی طلب اور فتح کی قدر و قیمت ہے جس سے تم ڈھیلے پڑتے ہو۔ حالانکہ ع

''شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ!''

اصل کامیابی تو یہ ہے کہ تم بس اللہ کی راہ میں اپنا تن من دھن لگا دو۔ جہاں تمہارے اندر جلد سے جلد فتح حاصل کرنے کی طلب پیدا ہو جائے گی' یا تم عجلت پسندی کا شکار ہو جاؤ گے' یا کوئی راہِ یسیر (شارٹ کٹ) تلاش کرو گے' ٹیڑھی انگلیوں سے مکھن نکالنے کی کوشش کرو گے تو نتیجتاً اصل منزل سے ہٹ جاؤ گے۔ یہ ساری حماقتیں صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ دُنیوی فتح محبوب ہے۔ دنیاوی سطح پر کامیاب ہو جانا' اس کی نگاہ کے اندر اہمیت پیدا ہو گئی ہے اور یہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ غزوۂ اُحد میں بھی غلطی اسی بنیاد پر ہوئی۔ یہ بات بالکل نفسیاتی اعتبار سے ہے۔ جب آپ طے کرتے ہیں کہ آپ کو سو (۱۰۰) میل جانا ہے تو آپ شاید

۸۰ یا ۹۰ میل پر جا کر کچھ ڈھیلے پڑیں کہ اب تو منزل قریب آ گئی ہے۔ اور اگر آپ نے اپنی منزل ہی ۲۰ میل پر متعین کر لی ہے تو یہی کیفیت ۱۷، ۱۸ میل پر پیدا ہو جائے گی۔ کسی شخص کی اپنے کام کے لیے جتنی مطابقت (adjustment) ہوتی ہے اس کے اندر اتنے ہی عرصہ کے لیے چاک و چوبند ہونے اور آمادۂ عمل رہنے کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ اور منزل پر پہنچ کر تو آدمی ڈھیلا پڑتا ہی ہے۔ اس کے بعد تو اعصاب ڈھیلے پڑتے ہیں، آدمی کپڑے اتارتا ہے اور پُرسکون (relax) ہو جاتا ہے کہ اب پہنچ گئے۔ تو یہی فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے اس relaxation کے تحت نظم کو ڈھیلا کیا ہے۔ جس انداز سے میں نے یہ آیت سمجھائی ہے اس طرح حقیقت کے اعتبار سے ہمیں جو سبق لینا ہے وہ ہمیں پورا مل جائے گا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں سوءِ ظن بھی نہیں رہے گا۔

اسی آیت میں آگے فرمایا جا رہا ہے: ﴿مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ﴾ ”تم میں سے کچھ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور کچھ آخرت چاہتے تھے“۔ اب اس کی تاویل بھی ہم اسی طور سے کریں گے کہ تم میں وہ بھی ہیں جو دنیا میں فتح کے طالب ہیں اور وہ بھی ہیں جو صرف آخرت کے طالب ہیں۔ جبکہ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ جیسے سورۃ التغابن میں آیا: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ﴾ (آیت ۹) ”جس دن (اللہ) تم کو جمع کرے گا جمع ہونے کے دن وہ ہوگا اصل ہار اور جیت کے فیصلے کا دن“۔ ہار اور جیت کا فیصلہ تو وہاں ہوگا، یہاں کی ہار ہار نہیں، یہاں کی جیت جیت نہیں۔ کتنے ہیں جو جیت کر ہارتے ہیں اور کتنے ہیں جو ہار کر جیتتے ہیں۔ سورۃ التغابن کے یہ الفاظ اپنے دل پر نقش کر لیجیے۔ یہاں کی فتح کا تصور ہی نہ رکھو۔ اس دنیا کی کامیابی کی کوئی غرض ہی نہ رکھو! بلکہ احساسِ فرض کے تحت حرکت کرو۔ دنیا میں کامیابی کا کتنے فیصد امکان ہے اور کتنے فیصد نہیں ہے، یہ حساب کتاب اس راستے پر نہیں چلے گا۔ صد فیصد ناکامی کا یقین ہو پھر بھی انسان اس راہ پر چلے گا اگر اس کا مطلوب صرف آخرت ہو۔ یہی بات تھی کہ جنگ موتہ کے موقع پر صرف تین ہزار کا لشکر ایک لاکھ سے ٹکرا گیا تھا۔ اور وہ کسی ایک شخص کا فیصلہ بھی نہیں تھا، بلکہ اس ضمن میں باقاعدہ مشورہ ہوا ہے، باقاعدہ تقریریں



ہوئی ہیں۔ یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ یہ معاملہ درست نہیں ہے، کیونکہ نسبت تناسب میں بہت زیادہ فرق ہے، ایک اور تینتیس کی نسبت ہے۔ لیکن کچھ لوگوں نے کہا، اور ان کی رائے مانی گئی، کہ ہمارا مطلوب و مقصود فتح کب ہے؟ ہمارا مطلوب و مقصود تو شہادت ہے!

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

لہٰذا وہاں افہام و تفہیم سے بات طے ہوئی، کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اور اس پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کوئی سرزنش نہیں کی گئی، بلکہ مسلمانوں نے اس بات پر سرزنش کی کہ یہ لوٹ کر کیوں آئے؟ لوگوں نے ہاتھوں میں ریت اٹھا کر لوٹنے والوں کے چہروں پر پھینکی۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن کا دفاع کیا اور فرمایا کہ انہوں نے میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار نہیں کی، بلکہ ان کا معاملہ ”مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ“ والا ہے، یعنی اپنی اصل قوت کی طرف رجوع کرنے کا معاملہ ہے، تاکہ پھر سے طاقت لے کر آئیں اور حملہ کریں، یہ فرار نہیں ہے۔

بہرحال اس فرق کو ذہن میں رکھیے! اسی لیے ہم اتنی وضاحت سے بحث کرتے ہیں کہ ہمارا نصب العین صرف اور صرف اللہ کی رضا اور اُخروی فلاح ہے۔ نصب العین انقلاب یا اقامت دین اور دین کا غلبہ نہیں ہے۔ جہاں یہ چیزیں نصب العین کے درجہ میں آئیں گی وہاں حماقتیں لازماً ہوں گی، غلطیاں لامحالہ ہوں گی۔

آگے ارشاد ہوا: ﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ﴾ ”پھر اللہ نے تمہیں پھیر دیا اُن سے، تاکہ تمہیں آزمائے“۔ دیکھئے عجیب انداز ہے کہ ”تمہیں پھیر دیا اُن سے“۔ مطلب یہ کہ تم دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ اب ہوا یہ کہ تم جس کی قوت سے یہ سب کچھ کر رہے تھے اب اس قوت نے گویا تمہارا رُخ پھیر دیا۔ کفار نے تمہارا رُخ نہیں پھیرا، یہ رُخ اس نے پھیرا ہے، تاکہ تمہیں جانچے، پرکھے، تمہیں ابتلاء میں ڈالے، تاکہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو اور تم آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کر سکو۔ تمہاری اس غلطی سے درگزر بھی کیا جا سکتا تھا کہ تمہیں اُس وقت کوئی سزا نہ دی جاتی، لیکن پھر یہ غلطی تمہارے اندر راسخ ہو جاتی۔ پھر تمہارا ڈھیلا پن مستقل ہو جاتا۔ تمہیں سبق سکھانا مقصود تھا، تمہاری تربیت

پیشِ نظر تھی، تمہاری اصلاح مقصود تھی۔ سرزنش اس لیے ضروری تھی تا کہ ایک دفعہ بات واضح ہو جائے کہ نظم کسے کہتے ہیں، ڈسپلن کے کیا معنی ہیں، اطاعتِ امر کی کیا حیثیت اور کیا اہمیت ہے۔ یہاں ''لِيَبْتَلِيَكُمْ'' کا لفظ آیا ہے کہ اللہ تمہاری آزمائش کرے۔ بَـلَا، يَبْلُوْ آزمائش کے لیے آتا ہے۔ اسی سے ابتلاء بنا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ﴾ (الملک:۲) ''اللہ نے موت اور حیات کو پیدا فرمایا تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون حسنِ عمل کا مظاہرہ کرنے والا ہے''۔

اہلِ ایمان کی تسلی کے لیے آگے فرمادیا: ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ﴾ ''اور واقعی وہ تمہیں معاف فرما چکا''۔ اب تمہارے لیے آخرت کی کوئی سزا نہیں ہے، جو بھی سرزنش تھی یہاں ہو گئی۔ ﴿وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ١٥٢﴾ ''اور اللہ اہلِ ایمان پر بہت بڑے فضل والا ہے''۔

## ''اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ'' کا مفہوم

سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۴ میں الفاظ ہیں: ﴿يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ﴾ ''یہ کہتے ہیں کہ ہمارا بھی امر میں کوئی حصہ ہے یا نہیں؟'' یعنی ہماری بھی کوئی بات مانی جائے گی یا نہیں؟ کوئی ہماری بھی رائے چلے گی یا نہیں؟ یہ انسان کی طبعی وفطری کمزوری ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ میں بھی اختیار ہو، میری رائے کو بھی اہمیت دی جائے۔ یہی وہ sense of participation ہے جسے ملحوظ رکھنا حکومت اور ریاست کی سطح پر بہت ضروری ہے کہ ہمارا معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم اس میں شرکت (participate) کر رہے ہیں، ہماری رائے سے فیصلے ہوتے ہیں۔ لیکن جماعتی سطح پر، اُس نظم میں جو بیعتِ سمع و طاعت پر قائم ہو، یہی چیز سب سے بڑی مہلک شے بن جاتی ہے۔ چنانچہ ان کی اس بات کا کہ ''اس امر میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے یا نہیں؟'' جو جواب دیا گیا وہ بڑا عجیب ہے: ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ﴾ ''(اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے کہ یقیناً امر تو کُل کا کُل اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ اس جواب پر وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے تو رسول



کے حکم سے اختلاف کیا تھا، اللہ کے حکم سے کب کیا تھا؟ یہ تو رسول کا اجتہادی حکم تھا۔

اس کا پس منظر ذہن میں رکھئے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر عبداللہ بن اُبی اور اس کے ۳۰۰ ساتھی کیوں واپس گئے تھے؟ اس لیے کہ اُس نے یہ رائے دی تھی کہ مدینہ میں محصور رہ کر دفاع کیا جائے۔ جیسے کہ دو سال بعد غزوۂ احزاب میں ہوا اور اللہ کے فضل و کرم سے بارہ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی اپنی رائے بھی یہی تھی، لیکن آپ ؐ نے صحابہ کرام ؓ کے جوشِ ایمان اور ذوقِ شہادت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی رائے کا احترام کیا اور مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ اب دیکھئے۔ اوّلاً یہ اللہ کا حکم نہیں تھا، ثانیاً رسول اللہ ﷺ کی بھی یہ رائے نہیں تھی۔ ہاں، رسول ؐ نے جو فیصلہ کر دیا یہ اس کی مخالفت ہے۔ اگرچہ رسول ؐ نے اپنی رائے کو پس پشت رکھ کر اپنے ساتھیوں کی رائے کے مطابق فیصلہ کیا، لیکن اب اس سے اختلاف رسول اللہ ﷺ کے فیصلے سے اختلاف ہے۔ چنانچہ اس کو واضح کر دیا گیا کہ چاہے یہ اتنا سا معاملہ ہے، لیکن حقیقت میں یہ اللہ کی معصیت ہے، یہ اللہ کے اختیار کو چیلنج کرنا ہے۔ ایک سپاہی جب یونیفارم میں ہے تو وہ حکومت کا نمائندہ ہے، اس کی توہین حکومت کی توہین ہے اور اس کی اطاعت حکومت کی اطاعت ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک حکومتی نظم کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اگر وہ وردی میں نہیں تو عام انسان ہے، اس کے ساتھ آپ کا جھگڑا ذاتی سطح پر شمار ہوگا، لیکن اگر وہ وردی اور پیٹی میں ہے تو اسے چیلنج کرنا حکومت کو چیلنج کرنا ہے۔ لہٰذا یہ نظم کا معاملہ ہے۔ اور جب یہ اس سطح پر آئے گا تو بات اللہ تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ امر کُل کا کُل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ حالانکہ ہم ابھی سورۃ النساء کی آیت میں ''اُولِی الْاَمْرِ'' کے الفاظ پڑھ کر آئے ہیں، یعنی تم میں سے جو اصحابِ امر ہیں۔ بظاہر تو یہاں تضاد معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فرمادیا: ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ﴾ ''کہہ دیجیے کہ امر کُل کا کُل اللہ کے لیے ہے!'' تو اس تضاد کو جو بظاہر پیدا ہو رہا ہے، رفع کر لیجیے۔ درحقیقت اس chain کے ساتھ اگر کوئی امر آ رہا ہے تو وہ حقیقتاً اللہ کا ہے، وہ علیحدہ نہیں رہا۔ اللہ کا رسول حکم دے رہا ہے تو اللہ کا حکم ہے۔ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کے نیچے جو نظمِ جماعت بنا ہے اس کا حکم بھی اللہ کا حکم ہے ع

''ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ!''

## آیۂ استخلاف کے مضامین کا اجمالی جائزہ

آج کے درس کے ضمن میں آخری مقام سورۃ النور کی تین آیات (۵۴ تا ۵۶) پر مشتمل ہے۔ اس میں سے اکثر حصے کا مفہوم تو ہمارے سامنے آ چکا ہے' صرف ایک نکتہ ہے جس کی وضاحت درکار ہے' باقی ہم صرف ترجمہ کریں گے۔ فرمایا: ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ﴾ ''کہہ دیجیے (اے نبیؐ!) اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی''۔ اب یہاں ہر جگہ پر مقدر (understood) مانیے: ﴿وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾ ''اور اپنے میں سے اصحابِ امر کی''۔ آگے فرمایا: ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ﴾ ''پھر اگر وہ روگردانی کریں (پیٹھ موڑ لیں) تو جان لو کہ رسولؐ پر ذمہ داری ہے اس کی جس کا بوجھ اس پر ڈالا گیا ہے اور تم پر ذمہ داری ہے اس کی جس کا بوجھ تم پر ڈالا گیا''۔ صاحب امر بھی اللہ کے ہاں مسئول ہے اور تم بھی اللہ کے ہاں مسئول ہو۔ رسول کے ذمہ ابلاغ اور تبلیغ کا حق ادا کر دینا ہے اور تمہارے ذمہ اسے قبول کرنا ہے۔ اگر بالفرض ابلاغ میں کمی رہی تو رسول پکڑے جائیں گے اور اگر انہوں نے اپنا کام پورا کر دیا تو رسول بری ہو جائیں گے اور اب ساری پُرسش تمہاری ہو گی۔ اسی طرح امراء کے ذمے جو بھی فرائض اور ذمہ داریاں ہیں وہ ان کے مسئول ہیں' انہوں نے جلد بازی میں فیصلہ کر لیا تو اپنی جواب دہی اللہ کے یہاں کریں گے' انہوں نے تمہارے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا تو وہ اس کے لیے اللہ کے حضور جواب دہ ہوں گے' لیکن اگر مأمورین نے اپنے فرائض ادا نہ کیے تو اُن کی پُرسش ہو گی۔ دنیا میں کوئی چیز یک طرفہ تو ہوتی نہیں۔ اگر مأمورین کے کچھ فرائض ہیں تو امراء کے بھی فرائض ہیں اور امراء کے حقوق ہیں تو مأمورین کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ لیکن ہمارا تصور یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی پر توجہ کو مرتکز کرے' اپنے حقوق کی طلب پر توجہ کا ارتکاز نہ کرے۔ اگر کوئی حق مارا گیا تو دنیاوی اعتبار سے تو نقصان ہے' مگر اُخروی اعتبار سے نفع ہے۔ ذمہ داری تو اس پر



ہے جس نے آپ کا حق مارا ہے۔ آخرت میں جا کر لین دین ہو جائے گا' حساب کتاب ہو جائے گا۔ وہاں تم کچھ حاصل ہی کرو گے' ہاتھ سے کچھ دینا نہ پڑے گا۔ اگر اصل ''یوم التغابن'' آخرت ہے تو تمہارے لیے یہ نفع کا سودا ہے' نقصان کا تو نہیں۔

یہاں سورۃ الاعراف کی یہ آیت بھی پیش نظر رکھئے جو تصورِ شہادت علی الناس کے ضمن میں بہت اہم ہے: ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶﴾ ''ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان سے بھی جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا تھا اور لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی''۔ رسول بھی تو مسئول ہے' وہ بھی بندہ ہے (وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ) پھر ان کے نیچے جو بھی نظمِ جماعت کے صاحبِ امر ہوں گے وہ بھی غیر معصوم انسان ہیں' ان سے بھی خطا اور نسیان کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سمجھنے کی اصل بات یہ ہے کہ تم اپنی ذمہ داری کو دیکھو کہ کیا ہے' اس میں تو کوئی کمی نہیں کر رہے؟ اس کی جواب دہی تمہیں کرنی پڑے گی۔

﴿وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ﴾ ''اور اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے''۔ ﴿وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۵۴﴾ ''اور رسول کے ذمہ نہیں ہے مگر صاف صاف پہنچا دینا''۔

آگے فرمایا: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ......﴾ ''اللہ نے وعدہ کیا ہے تم سے یعنی اُن سے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے......'' میں نے ''یعنی'' کے ساتھ ترجمہ اس لیے کیا ہے کہ یہاں ''مِنْ'' تبعیضیہ نہیں ہے' بلکہ ''مِنْ'' بیانیہ ہے۔ اس وعدہ کے اوّلین مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں اور ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے کہ بعض کے ساتھ یہ وعدہ ہو اور بعض کے ساتھ نہ ہو' بلکہ مِنْ بیانیہ ہے کہ تم سے یعنی اُن سے جو ایمان لائے ہوں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہوں۔ البتہ ان کے بعد سب کے لیے یہ مِنْ تبعیضیہ ہے۔ یہ نہیں کہ جو بھی جماعت قائم ہو جائے اور جو لوگ بھی اس کام کے لیے کمر کس لیں اُن سے یہ وعدہ ہے۔ بلکہ اُن کے ساتھ اللہ کا وعدہ ایمان اور عمل صالح کے تقاضوں کے ساتھ مشروط ہو گا۔ حتمی اور قطعی وعدہ اور بشارت صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے

تھی۔ بعد کا معاملہ مشروط رہے گا۔ جو جس درجہ میں ان تقاضوں کو پورا کرے گا اسی درجہ میں وہ اس وعدہ کا مصداق بننے کی امید رکھ سکتا ہے۔ اور پھر بھی ہوسکتا ہے کہ ایک جماعت اپنے تئیں یہ سمجھ رہی ہو کہ وہ ایمان اور عمل صالح کے تقاضے پورے کر رہی ہے، لیکن ابھی اس کا اقتدار اللہ کی حکمت اور مصلحت میں نہ ہو۔ ابھی کوئی کمی ہے جسے اللہ جانتا ہے۔ تم تو اپنے آپ کو کامل سمجھ رہے ہو مگر اللہ جانتا ہے کہ تم کتنے کچھ کامل ہو اور کتنے کچھ نہیں ہو۔ ﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾﴾ (النجم) ''اپنے آپ کو نفسِ مزکّی نہ سمجھا کرو، وہ جانتا ہے اس کو جو واقعی متقی ہے''۔ بہرحال اللہ کا یہ وعدہ اُن لوگوں سے ہے جو ایمان اور عمل صالح کے تقاضے پورے کر دیں گے۔ یہاں اپنے ذہن میں سورۃ العصر کے مضامین تازہ کیجیے اور پھر پورا منتخب نصاب ذہن میں لے آیئے۔ عمل صالح سے مراد صرف نماز، روزہ اور نوافل نہیں، بلکہ عمل کا پورا ایک جامع تصور ہے۔ ایمان بھی صرف زبانی اقرار کا نام نہیں، بلکہ اس کے عملی تقاضے پورے کرنا بھی ضروری ہے۔

اللہ نے ان سے کیا وعدہ کیا ہے: ﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠﴾ ''وہ لازماً انہیں زمین میں خلافت عطا فرمائے گا جیسے کہ اس نے ان سے پہلوں کو خلافت عطا فرمائی تھی''۔ یہ آیت مبارکہ خاص طور پر یہاں شامل کی گئی ہے، ورنہ پہلی آیت پر ہمارا یہ درس مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ بہت اہم آیت ہے اور یہ خلافت راشدہ کی حقانیت پر اہل تشیع کے خلاف برہانِ قاطع ہے۔ اللہ کا یہ وعدہ جن حضرات سے پورا ہوا کیا وہ ایمان اور عمل صالح کے اعلیٰ ترین معیار پر نہیں ہوں گے؟ یا پھر (معاذ اللہ) اللہ کا وعدہ جھوٹا ہے اور اللہ منافقوں کے ساتھ یہ وعدہ کر رہا ہے؟ یہ خلافت بالفعل قائم ہوئی یا نہیں ہوئی؟ یہ تو تاریخی واقعہ ہے، اس میں تو کسی کو اختلاف نہیں ہوگا۔ تو کن سے یہ وعدہ کیا گیا تھا؟ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ یہ آیت ان کے غلط فلسفے اور گمراہ کن نظریات کے پورے تانے بانے کو ادھیڑ کر رکھ دینے والی ہے۔

اس وعدۂ استخلاف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ﴾ ''اور وہ لازماً تمکن عطا فرمائے گا (زمین میں جما دے گا) اُن کے



لیے اُن کے اس دین کو جو اللہ نے ان کے لیے پسند فرما لیا ہے''۔ یہ الفاظِ مبارکہ خلافت راشدہ کے لیے بھی سند ہیں اور خلفاء راشدین کے لیے بھی۔ ﴿وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ﴾ ''اور لازماً بدل دے گا اُن کے خوف کی اس کیفیت کے بعد اُس کو امن کی ایک حالت سے''۔ ان الفاظ میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ جن حضرات کی رائے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عہدِ خلافت، خلافتِ راشدہ میں شامل نہیں ہے، ان کے موقف کے لیے بھی دلیل موجود ہے۔ اس لیے کہ اس پورے عرصے میں امن نہیں تھا، یہ جنگ و جدال کا دَور تھا، تلواریں ایک دوسرے کے خلاف چلتی رہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ بہت منطقی انسان تھے۔ انہوں نے دو باتوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا کہ ایک شخص کا اپنی ذات میں خلیفۂ راشد ہونا اور ہے، جبکہ اس کے عہدِ خلافت کا خلافت راشدہ میں شامل ہونا اور ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ذات میں خلیفۂ راشد ہیں، خلافت راشدہ کے تمام معیارات ان کی ذات کی حد تک پورے ہیں، لیکن ان کا عہدِ حکومت اس معیار پر پورا نہیں اتر رہا۔ ایک تو اس عرصے میں افتراق رہا اور اس دَور میں عالمِ اسلام ایک وحدت نہیں رہا۔ دوسرے یہاں امن کی کیفیت نہیں تھی۔

آگے فرمایا: ﴿يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ﴾ ''وہ میری ہی بندگی کریں گے، میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کریں گے''۔ یہ بہت بڑی بڑی بشارتیں ہیں اور دورِ خلافت راشدہ کے چوبیس برس اس کا مصداقِ اَتم اور مصداقِ کامل ہیں۔ بعد میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ عمارت یک دم بالکل ہی زمین بوس ہوگئی ہو، بلکہ درجہ بدرجہ نیچے آئی ہے۔ لیکن ایک آئیڈیل اور ہر اعتبار سے دورِ نبوت کا عکسِ کامل یہ چوبیس یا ساڑھے چوبیس برس تھے۔ ﴿وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾﴾ ''اور جو اس کے بعد بھی کفر کرے گا تو وہی لوگ درحقیقت فاسق ہیں''۔ یہاں ''بَعْدَ ذٰلِكَ'' سے کیا مراد ہے؟ یہ کہ اس وعدے کے بعد بھی! اللہ کا اتنا پختہ وعدہ، اللہ کی طرف سے اتنی مؤثق توثیق اور پھر بھی کوئی کفر کرے! اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب دین اس طرح غالب ہو چکا ہو اور امن قائم ہو

چکا ہو‘ فتنہ باقی نہ رہے‘ اس کے بعد بھی اگر کوئی غلط راستے پر چلتا ہے تو وہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس میں خیر کا کوئی عنصر ہے ہی نہیں۔

آخری آیت میں فرمایا: ﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّكٰوۃَ......﴾ ’’اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو......‘‘۔ ہمارے آج کے درس کے خاتمے کے لیے یہ نہایت جامع اور نہایت موزوں الفاظ آ گئے ہیں۔ یہاں سورۃ الحج کی آخری دو آیات ذہن میں تازہ کیجیے جن میں ایمان کے منطقی تقاضے بیان کیے گئے ہیں: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ...... الخ﴾ دین کے عملی تقاضوں کی آخری سیڑھی جہاد فی سبیل اللہ ہے جسے آنحضورﷺ نے دین کا ’’ذروۃ السنام‘‘ قرار دیا ہے‘ لیکن عمل کے زینے کی پہلی سیڑھی فرائض دینی کی بجا آوری اور ارکانِ اسلام کی پابندی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے فرمایا: ’’رکوع کرو اور سجدہ کرو‘‘۔ پہلی سیڑھی پر قدم جماؤ گے تو دوسری پر چڑھنے کا امکان ہوگا۔ اگر یہیں پر قدم لرز رہے ہیں اور آپ کو استقامت حاصل نہیں تو اگلی کا کیا سوال؟ اسی لیے وہاں آخر میں پھر فرمایا: ﴿فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّكٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۷۸﴾﴾ ’’پس قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور مضبوط پکڑو اللہ (کی رسی) کو‘ وہ تمہارا مالک ہے‘ سو خوب مالک ہے اور خوب مددگار‘‘۔ یعنی اگر یہ سارا تصورِ دین سمجھ آ گیا اور تین منزلیں ذہن میں جم گئیں تو بسم اللہ کرو۔ کہاں سے کرو گے؟ قائم کرو نماز‘ ادا کرو زکوٰۃ! پہلی سیڑھی تو وہی ہوگی۔ ستون ڈالو گے تو چھت کا امکان ہے۔ پہلی منزل بنے گی تو دوسری کا امکان ہے اور دوسری بنے گی تو تیسری کا امکان ہے۔ لہٰذا وہاں (سورۃ الحج میں) جو ترتیب تھی وہی یہاں (سورۃ النور میں) ہے: ﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّكٰوۃَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾﴾ ’’اور قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور اطاعت کرو رسولؐ کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے‘‘۔ واضح رہے کہ یہاں رسولؐ کی اطاعت صرف رسول کی حیثیت میں مراد نہیں ہے‘ بلکہ امیر کی حیثیت میں بھی‘ سپہ سالار کی حیثیت میں بھی‘ چیف ایگزیکٹو کی حیثیت میں بھی اور چیف جسٹس کی حیثیت میں بھی مراد



ہے۔ چنانچہ آیتِ مبارکہ کے آخری الفاظ بہت معنی خیز ہیں: ﴿وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾﴾ ’’اور رسولؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے!‘‘

اللهم ربنا اجعلنا منهم‘ اللهم اغفرلنا وارحمنا واهدنا وعافنا وارزقنا‘ انت ولينا فى الدنيا والآخرة‘ توفنا مسلمين والحقنا بالصالحين برحمتك يا ارحم الراحمين OO

☆ —— ☆ —— ☆

# جماعتی زندگی کے مہلک ترین مرض

# نجویٰ

## کی حقیقت اور اللہ کی جانب سے اس کی شدید مذمت

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعدُ :

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ وَلَا خَمْسَۃٍ اِلَّا ھُوَ سَادِسُھُمْ وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ اَیْنَ مَا کَانُوْا ۚ ثُمَّ یُنَبِّئُھُمْ بِمَا عَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۷﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نُھُوْا عَنِ النَّجْوٰی ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا نُھُوْا عَنْہُ وَیَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ ۫ وَاِذَا جَآءُوْکَ حَیَّوْکَ بِمَا لَمْ یُحَیِّکَ بِہِ اللّٰہُ ۙ وَیَقُوْلُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ لَوْلَا یُعَذِّبُنَا اللّٰہُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ حَسْبُھُمْ جَھَنَّمُ ۚ یَصْلَوْنَھَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۸﴾ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَیْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْٓ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹﴾ اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطٰنِ لِیَحْزُنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَیْسَ بِضَآرِّھِمْ شَیْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰﴾ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ ۚ وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ ۙ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۱﴾ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ



الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىکُمْ صَدَقَۃً ؕ ذٰلِکَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَاَطْھَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲﴾ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىکُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ؕ وَاللّٰہُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾﴾ (المُجادلۃ)...... صدق اللّٰہ العظیم

## دینی ہیئتِ اجتماعیہ کے خلاف شیطان کے ہتھکنڈے

دینی مقاصد اور بالخصوص اقامت دین کے لیے جو بھی ہیئتِ اجتماعیہ وجود میں آتی ہے وہ یقیناً شیطان کی دشمنی کے لیے اور اسے للکارنے کے لیے ہی وجود میں آتی ہے‘ لہٰذا شیطان کے حملے کا سب سے بڑا نشانہ اور ہدف بھی وہ اجتماعیت ہی بنتی ہے۔ اس پہلو سے غور کیا جائے تو شیطان کے حملہ آور ہونے کے مختلف راستے ہیں۔ اوّلاً اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس ہیئتِ اجتماعیہ میں شریک ہر فرد کے دل میں وسوسہ اندازی کرے اور اس کے نفسانی داعیات اور محرکات کو مشتعل کرے۔ یہ کوشش تو شیطان ہر فردِ نوعِ بشر کے لیے کرتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ ایسے اشخاص کے لیے جو کسی ایسی اجتماعیت میں شریک ہوں جو شیطان کو للکارنے کے لیے وجود میں آئی ہو‘ اس کی یہ کوششیں دوچند ہو جائیں گی۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر وہ ایسے اشخاص کے باہمی رشتے کو کمزور کرنے‘ ان کی جمعیت میں رخنے ڈالنے‘ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرنے اور ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں کدورت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے‘ تاکہ یہ بنیانِ مرصوص نہ بن سکیں‘ ان کے مابین ایک دوسرے کے خلاف غلط فہمیاں پیدا ہوں اور ایک دوسرے سے بغض اور عداوت پیدا ہو جائے۔ یہ شیطان کی دوسری کوشش ہے۔ تیسری کوشش اس کی خاص طور پر یہ ہوتی ہے کہ اس اجتماعیت کے نظم کو بگاڑے اور اس نظم میں امیر اور مأمورین کے مابین جو ربط و تعلق ہے‘ اسے خراب کرے۔ اصل میں تو امیر اور مأمورین کے مابین یہ تعلق ہی ہے جو کسی نظم کے مؤثر ہونے میں سب سے زیادہ مفید ہے اور یہی چیز فیصلہ کن بھی ہے۔ تو اس اعتبار سے اس کا تیسرا حملہ اس تعلق کو کمزور کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ تو ہمارے اصل منتخب نصاب کے مختلف اسباق اور حصوں میں زیر بحث آتی ہے' دوسرا معاملہ بھی بالخصوص سورۃ الحجرات میں تفصیل سے زیر بحث آیا ہے۔ اس میں مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے ضمن میں جو مثبت احکام دیے گئے اور جن چیزوں سے روکا گیا ان کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ میں عام طور پر درس کے دوران یہ واضح کیا کرتا ہوں کہ اس کی کیا اہمیت ہے' مسلمانوں کی یہ شیرازہ بندی کیوں مطلوب ہے' اس میں پیدا ہونے والے رخنوں کا سدّ باب اتنا اہم کیوں ہے کہ اس کے لیے قرآن حکیم میں اس قدر اہتمام سے احکام دیے گئے ہیں؟ سورۃ الحجرات میں دو بڑے احکام نازل ہوئے ہیں اور ساتھ ہی دو آیات (۱۱'۱۲) میں چھ نواہی نازل ہوئے ہیں۔ جن چھ کاموں سے خاص طور پر روکا گیا ہے وہ یہ ہیں: تمسخر واستہزاء' عیب جوئی کرنا' ایک دوسرے کو برے ناموں سے پکارنا' سوءِ ظن پیدا کرنا' کسی کی برائی تلاش کرنے کے لیے اس کی ٹوہ میں لگے رہنا اور غیبت کرنا۔ اس لیے کہ ایک دوسرے کے مابین بدگمانی پیدا کرنا' دلوں کو پھاڑ دینا' کدورتیں پیدا کرنا' حسنِ ظن ختم کر کے سوءِ ظن کے بیج بو دینا' یہ تمام چیزیں خطرناک ہیں۔ درحقیقت ان کی اصل اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ کسی بھی فصیل کی مضبوطی کا دار و مدار دو چیزوں پر ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر اینٹ اپنی جگہ پختہ ہو اور دوسرے ان اینٹوں کو جوڑنے والا مواد یعنی سیمنٹ مضبوط ہو۔ اینٹوں کا پختہ ہونا انفرادی سیرت وکردار کی پختگی کا پروگرام ہے جو ہمارے منتخب نصاب کے حصہ سوم کا موضوع ہے۔ ان اینٹوں کو باہم جوڑنے' مضبوط کرنے اور ان میں کسی رخنے کو راہ نہ پانے دینے کے ضمن میں احکامات سورۃ الحجرات میں آ گئے کہ اس اجتماعیت میں شریک افراد کے مابین اگر کہیں اختلاف ہو تو اسے فوراً رفع کرنے کی کوشش کرو' افتراق کی روش درست نہیں ہے۔ خواہ مخواہ کی افواہوں پر اعتماد نہ کرو' بلکہ افواہوں کی روک تھام کرو۔

یہ دو حکم تو بڑے ہیں۔ ان کے علاوہ جو چھ نواہی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کا استہزاء نہ کرو' تمسخر نہ کرو۔ بسا اوقات آدمی اپنے کسی دوست اور رفیق سے یوں



ہی لائٹ موڈ میں کوئی بات کرتا ہے اور اس سے اس کا دل دکھانا مقصود نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ممکن ہے وہ دوست اس سے قبل دس بار وہ بات ہنس کر ٹال چکا ہو' لیکن عین ممکن ہے کہ گیارہویں مرتبہ وہ بات تیر کی طرح سیدھی اس کے دل پر جا لگے اور اس کا دل زخمی ہو جائے۔ اب نتیجتاً اس سے محبت کا تعلق کمزور پڑے گا اور اس کے دل کی کیفیت کھردری سطح کی مانند ہو جائے گی جس پر اب میل جمنا شروع ہو جائے گا۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ استہزاء سے بچو۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ۚ﴾ (الحجرات:۱۱) ''اے ایمان والو! (تم میں سے) کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے' ہوسکتا ہے کہ وہ ان (مذاق اڑانے والوں) سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہوسکتا ہے وہ ان (مذاق اڑانے والیوں) سے بہتر ہوں''۔ یہ تو ایسا حکم ہے جو مَردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے لیے بھی دہرا کر لایا گیا ہے۔ اگلی بات یہ فرمائی کہ: ﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اور ایک دوسرے کی عیب چینی نہ کرو (تہمتیں نہ لگاؤ)'' اگر کسی کا واقعی کوئی ایسا معاملہ ہے تو خواہ مخواہ اسے جتلانا درست نہیں ہے' اس سے بھی اس کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہ بھی وہ چیز ہے جو باہمی رشتۂ اُلفت کو ختم کر دیتی ہے۔ پھر فرمایا: ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ﴾ ''اور ایک دوسرے کو (بُرے) ناموں سے نہ پکارو''۔ وہ نام کہ جو خواہ مخواہ کسی کو چھیڑنے کے لیے ہوں ان سے شدت کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ پھر یہ کہ سوءِ ظن سے بچو! اس کے لیے الفاظ آئے ہیں: ﴿اِجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ ''بہت زیادہ گمان کرنے سے بچو! یقیناً بعض گمان گناہ ہیں''۔ اس سے آگے ہے: ﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ ''اور تجسّس نہ کرو''۔ اگر کوئی ناخوشگوار چیز سامنے آ بھی گئی ہے تو پردہ پوشی کرو' نہ یہ کہ خود پردے اٹھا اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کرو۔

## غیبت = جماعتی زندگی میں رخنہ اندازی کا ایک بڑا ذریعہ

اس سلسلۂ نواہی میں مزید ارشاد ہے: ﴿وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ﴾ ''اور تم میں

کا ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرے‘‘۔ اس لیے کہ غیبت تو سب سے ثقیل اور قبیح حرکت ہے۔ غیبت یہ ہے کہ اپنے کسی بھائی کی کسی برائی یا عیب کا ذکر اس کی عدم موجودگی میں کرنا۔ ویسے تو یہ باتیں ہمارے عام مجلسی اور معاشرتی آداب میں شامل ہیں‘ لہٰذا ہر مسلمان کے ساتھ یہی معاملہ کرنا ہے‘ لیکن اقامتِ دین جیسے عظیم مقصد کے لیے قائم کی گئی جماعت کے رفقاء کے لیے ان احکامات کی ضرورت واہمیت سوگنا بڑھ جاتی ہے اور انہیں ان تمام چیزوں کا سوگنا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے‘ اس لیے کہ یہاں شیطان سوگنا زیادہ زور لگائے گا۔

جماعتی نظم کے حوالے سے غیبت خاص طور پر قابلِ وضاحت ہے۔ جان لیجیے کہ ایک تو تنقید ہوتی ہے کہ کسی کو اس کی کسی کمزوری‘ کوتاہی اور کسی عیب وغیرہ پر متنبہ اور مطلع کرنا۔ یہ تو اصلاح کے لیے اجتماعیت کی ایک اہم اور ناگزیر ضرورت ہے۔ لیکن اس کے کچھ آداب ہیں۔ اوّلاً یہ کہ آپ اپنے کسی بھائی میں کوئی کمزوری دیکھیں تو خود اُس سے اُس معاملے میں بات کریں‘ اسے تنہائی میں سمجھائیں اور مطلع کریں‘ سب کے رُوبرو اُس کا تذکرہ نہ کریں۔ ثانیاً آپ کے انداز میں اس حد تک دل سوزی ہو کہ وہ خود محسوس کرے کہ میرے سامنے یہ بات کر کے اسے کوئی خوشی نہیں ہو رہی‘ یہ کوئی لذت نہیں لے رہا‘ کوئی اپنی بڑائی کا اظہار نہیں کر رہا اور میری عزتِ نفس کو مجروح کرنا اس کے پیشِ نظر نہیں ہے‘ بلکہ یہ فی الواقع دل سے میری اصلاح کا خواہاں اور کوشاں ہے۔ یہ دو شرطیں اگر پوری نہ ہوں تو تنقید مہلک اور مضر ثابت ہوتی ہے اور اپنی افادیت کا پہلو کھو دیتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر مَیں ایک اور بات کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ دیکھیے تنظیم اسلامی میں یہ بات طے ہے کہ اس سے کسی رفیق کے اخراج کا معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔ کسی شخص کا معاملہ ایسا ہو جس سے تنظیم کی بدنامی کا اندیشہ ہو جائے تو اس کا اخراج عمل میں آ سکتا ہے۔ کسی ساتھی نے اپنے اس بھائی کی اصلاح کی انفرادی سطح پر پوری کوشش کر لی‘ اس سے بار بار ملا اور تنہائی میں دل سوزی اور خلوص واخلاص کے ساتھ گفتگو کی‘ لیکن وہ سمجھ رہا ہے کہ اصلاح کی طرف اس کا کوئی رجحان نہیں ہے اور اس چیز کی اطلاع اصحابِ امر تک پہنچا دینا جماعتی مصلحت کے لیے ضروری ہے اور اس سے مقصود اجتماعیت کو اس کے مضر اور منفی



اثرات سے بچانا ہے تو عام رفیق کا کام یہ ہے کہ صاحب نظم کو اس سے مطلع کر کے خاموش ہو جائے۔ دوسرے ساتھیوں میں اس کی برائی کا چرچا کرنا اور لذت لے لے کر اس کا ذکر کرنا انتہائی مہلک شے ہے۔ یہ ہے وہ غیبت جس کے لیے قرآن کریم میں سخت ترین الفاظ آئے ہیں: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ ط﴾ ’’کیا تم میں سے کوئی شخص اسے پسند کرے گا کہ اپنے کسی مُردہ بھائی کا گوشت (اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر) کھائے؟ یہ تو تمہیں انتہائی ناپسند ہے‘‘۔ لیکن تم غیبت کرتے ہو ھَنِیْئًا مَّرِیْئًا‘ خوب لذتیں لے لے کر اور چٹخاروں کے ساتھ۔ تو جماعتی زندگی میں اس چیز کو channelize کرنا ضروری ہے۔ کسی مقامی تنظیم کا امیر اگر اپنے کسی ساتھی میں کوئی کمزوری دیکھتا ہے اور اس نے اپنے اُس ساتھی کی اصلاح کی ہر ممکن کوشش بھی کر لی ہے مگر وہ اصلاح پر مائل نہیں ہو رہا‘ تو اب اس مقامی امیر کو پہلے تو یہ judgement کرنی ہو گی کہ یہ عام کمزوری اور خامی ہے یا اس نوعیت کی ہے کہ اس سے جماعت کی نیک نامی پر حرف آ سکتا ہے۔ اگر صورت دوسری ہے تو وہ بھی اپنے سے بالاتر اصحابِ امر تک اطلاع پہنچائے اور یوں سمجھے کہ اس کی ذمہ داری ختم ہوئی۔ اب یہ معاملہ ان کے ہاتھ میں آ گیا ہے اور وہ اسے کس طور سے نمٹاتے ہیں یہ ان کی ذمہ داری ہے۔

## مرضِ ’’نجویٰ‘‘ کے اسباب وعلامات

پہلی بات تو یہ ہے جو اجمالاً آپ کے سامنے آ گئی کہ اس ہیئتِ اجتماعیہ میں اگر proper channels کا اہتمام نہیں ہو گا تو شیطان کو دلوں کے پھاڑنے اور نفرتوں اور کدورتوں کی فصلیں اگانے کا بڑا موقع ملے گا۔ لیکن یہی مسئلہ جب رفقاء کی جانب سے امراء کے ساتھ پیش آتا ہے تو اس کا نام ’’نجویٰ‘‘ بنتا ہے۔ اب یہ غیبت سے کئی گنا زیادہ قبیح شے بن جاتی ہے۔ اب تک تو میں نے سورۃ الحجرات میں وارد معاشرتی احکام اور نواہی کا اعادہ کیا ہے کہ ایک مسلمان معاشرے اور مسلمانوں کی ہیئتِ ملّی میں ان چیزوں کی کیا اہمیت ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اقامت دین کے عظیم مقصد کے لیے قائم اجتماعیت کے لیے اس کی اہمیت سوگنا بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ جب غیبت کا معاملہ اصحابِ امر کے ساتھ

آئے گا تو یہ چیز اس سے بھی سو گنا زیادہ قبیح اور مہلک ہو جائے گی۔ اس کا کیا سبب ہے؟ پہلے اسے سمجھ لینا چاہیے۔ دراصل امیر اور مأمورین کا رشتہ ایسا ہے کہ اس میں گاہے بگاہے مأمورین کی عزتِ نفس کے مجروح ہونے کا امکان فطری طور پر موجود ہے۔ اوّل تو کسی کا حکم ماننا انسانی طبیعت بالعموم گوارا نہیں کرتی، پسند نہیں کرتی۔ انسان کا نفس اسے یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ اصحابِ امر کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں، یہ کون سے آسمان سے نازل ہوئے ہیں کہ مجھے حکم دیں، میں ان سے کس پہلو میں کمتر ہوں!

میں یہاں تک عرض کر رہا ہوں کہ حضورﷺ کا معاملہ ہمارے اعتبار سے تو بہت مختلف ہے اور اُس وقت جو لوگ موجود تھے ان کا معاملہ بھی ہم سے بہت مختلف تھا۔ ہمارے لیے تو حضورﷺ کی حیثیت اب ایک ادارے (institution) کی ہے، حضورﷺ بنفسِ نفیس، گوشت پوست سے بنے ہوئے انسان کی صورت میں ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں، اور اللہ تو ویسے بھی ہمارے سامنے نہیں ہے، لہٰذا ہمارے لیے اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت، یہ دونوں درحقیقت ادارے ہیں۔ اس وقت ہمارے اور رسول اللہﷺ کے مابین صرف اُمتی اور رسول کی نسبت ہے، جبکہ اس وقت کے لوگوں کا معاملہ یہ تھا کہ ایک تو رسولﷺ ان کے سامنے گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان کی صورت میں موجود تھے، عام انسانوں کی طرح وہ بھی کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے۔ پھر یہ کہ حضورﷺ کے ساتھ ان کی اور بھی بہت ساری نسبتیں موجود تھیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عباس اور حضرت حمزہ (رضی اللہ عنہما) حضورﷺ کے چچا ہیں، لہٰذا آپؐ تو بھتیجے ہونے کے اعتبار سے ان سے چھوٹے تھے۔ صحابیات (رضی اللہ عنہن) میں وہ بھی ہیں جو حضورﷺ کی ازواجِ مطہرات ہیں۔ ان کے اور آنحضورﷺ کے مابین نسبت صرف رسول اور اُمتی کی نہیں ہے، شوہر اور بیوی کی بھی ہے۔ اسی طرح آپ قیاس کرتے چلے جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہاں نسبتیں بھی بہت سی تھیں۔ اس پہلو سے اس وقت آپﷺ کی اطاعت کا معاملہ آج کی نسبت زیادہ مشکل تھا۔ اس لیے کہ اُس وقت ایک تو نگاہوں کے سامنے موجود ایک گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان کی اطاعت مطلوب تھی اور دوسرے یہ کہ ان کے ساتھ اور بھی



کافی نسبتیں تھیں جو کہ ہماری نہیں ہیں۔ ہمارے لیے حضورﷺ کی اطاعت بہت آسان ہے، جبکہ ان لوگوں کے لیے اس معاملے میں بڑی اضافی دقتیں اور پیچیدگیاں تھیں۔ چنانچہ انہیں یہ وسوسے پیش آ سکتے تھے کہ ان کی ہر بات ماننے کی کیا ضرورت ہے! یہ ہم تک اللہ کا جو حکم پہنچاتے ہیں ہم اسے مان لیتے ہیں، لیکن ان کی ہر بات کیوں مانیں! اسی موقف کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿۶۵﴾﴾ (النساء)

''نہیں (اے محمدﷺ!) آپ کے ربّ کی قسم! یہ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہر اختلافی معاملے میں جو اِن کے مابین اٹھ کھڑا ہو، آپ کو آخری حَکَم تسلیم نہ کریں، اور جو فیصلہ بھی آپ کریں (نہ صرف یہ کہ اسے بے چون و چرا قبول کریں، بلکہ) اپنے دل میں بھی اس کے بارے میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں، اور (آپ کی) فرمانبرداری قبول کر لیں جیسا کہ اس کا حق ہے''۔

اس طرزِ تخاطب میں جو زور ہے وہ اس پس منظر میں نکھر کر سامنے آتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص مشورہ دے اور اس کا مشورہ قبول نہ کیا جائے، تو اس کے دل پر اس کا ایک ردّعمل لازماً ہوگا کہ انہوں نے میری بات کو اہمیت نہیں دی، مجھے کم تر سمجھا، کسی اور کی بات کو زیادہ اہمیت دی۔ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی اجتماعی ضرورت کے تحت محسوس ہو کہ شاید صاحبِ امر کا التفات کسی اور کی طرف زیادہ ہے اور میری طرف کم ہے۔ اس سے بھی نفس کے اندر لازماً ایک ردّعمل پیدا ہوتا ہے۔ اور ایسا لازماً ہوتا ہے، کوئی نظم اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اور کبھی کسی کوتاہی پر سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی وہ چیز ہے جس سے انسان کے اندر شدید ردّعمل پیدا ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنی جگہ پر صحیح ہو لیکن کسی مغالطے کی بنا پر اس کو خواہ مخواہ ڈانٹ دیا جائے۔ اس کا بھی بہرحال امکان موجود ہے۔ نبی اکرمﷺ کی ذات اس طرح کے مغالطے سے بَری ہے، کوئی اور تو اس سے بَری نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اصحابِ امر تک کوئی غلط اطلاع پہنچی ہو، یا ان

کے اپنے مشاہدے میں یا اپنی سوچ میں کوئی غلطی ہو۔ اب اس میں مزید دس گنا زیادہ امکان پیدا ہوگا کہ طبیعت میں ردّعمل اور آزردگی (resentment) پیدا ہو جائے۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں کہ جن سے امیر اور مأمور کا رشتہ بہت نازک ہو جاتا ہے۔ اگر اس میل کو انسان شعوری طور پر صاف نہ کرتا رہے اور وہاں کھردری سطح برقرار رہے تو وہاں میل جمع ہوتا رہے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی زبان سے کبھی کوئی چبھتا ہوا فقرہ نکل جائے گا' کبھی آپ کوئی استہزائیہ کلمہ کہہ دیں گے۔

پھر کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی نے محسوس کیا کہ کوئی اور بھی ہے جس کے دل میں ایسے جذبات ہیں تو اب ایک انسیت محسوس ہوگی اور وہ جا کر اس سے دکھ درد بیان کرے گا کہ دیکھئے اس جماعت میں آنے کی ہماری کوئی ذاتی غرض تو نہیں ہے' فلاں صاحب ہم سے کوئی برتر نہیں ہیں کہ ہم سے اس طرح کا معاملہ ہو رہا ہے۔ اب وہ دو سے تین' پھر تین سے چار ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ ایک جتھے کی شکل اختیار کر لیں گے اور ان کے مابین ایک دوسرے کے لیے قرب اور دلوں کی نرمی پیدا ہو جائے گی۔ اب صورتِ حال یہ ہوگی کہ کسی اجتماع میں جہاں بیٹھے ہیں یکجا بیٹھے ہیں۔ اب امیر اگر کچھ کہہ رہا ہے تو اس پر آنکھوں آنکھوں میں باتیں کر رہے ہیں کہ دیکھا' یہ بات نکل آئی نا جو ہم سوچتے تھے' ہمارا خیال صحیح ہوا کہ نہیں! اس طرح آنکھوں آنکھوں میں تبادلۂ خیال ہوتا ہے' پھر فقرے چست کیے جاتے ہیں۔ اس کے لیے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اجتماع میں مل جل کر بیٹھیں' آس پاس صرف وہی لوگ ہوں جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کا احساس ہے اور کسی اور کو قریب نہ آنے دیں' تاکہ اگر کوئی فقرہ چست کیا جائے تو کوئی سن کر آگے نہ پہنچا دے۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ تنہائی میں کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ غیبت جو بہت لذیذ شے ہے' جب یہ امیر کے خلاف ہوگی تو بہت ہی لذیذ ہو جائے گی۔ اس میں یہ اضافی عوامل شامل ہو جائیں گے۔ جب بھی طبیعت کے اندر کسی وجہ سے منفی ردّعمل پیدا ہوگا تو اس سے جب کھیتی لہلہائے گی تو بہت بہار دے گی۔ اب کونوں کھدروں میں' علیحدگی میں گفتگو ہو رہی ہے' آپس میں بظاہر بہت دردمندانہ مشورے ہو رہے ہیں کہ دیکھئے' تنظیم میں ہمیں تو اس کی



مصلحت مطلوب ہے' یہ غلط رُخ پر چلے گئے ہیں' ان کا انداز غلط ہے' اس سے تنظیم کو نقصان پہنچ رہا ہے' ہم تو اس کی اصلاح کے لیے کوشاں ہیں' ہم تو اصل میں بھلائی کے لیے یہ سارے مشورے کر رہے ہیں' ہمیں کسی سے کوئی ذاتی نفرت اور کدورت نہیں ہے۔

اس حوالے سے وہ الفاظ ذہن میں رکھئے جو سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں آئے ہیں: ﴿وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾ ''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ مچاؤ (رخنہ اندازی نہ کرو' اس نظم کو کمزور نہ کرو' اس میں فتنے نہ اٹھاؤ) تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں''۔ ہم تو اصلاح کے لیے کوشاں ہیں' ہمارے مشورے تو اصلاح اور بہتری کے لیے ہیں۔ یہ تمام کیفیات ایک complex مرض کی علامات ہیں جو بہت سے امراض کا مرکب ہے۔ اس پورے مرض کے کیا اسباب ہیں؟ میڈیکل سائنس میں کسی مرض کی etymology کے دو حصے ہوتے ہیں: اوّلاً predisposing factors جن کی وجہ سے مرض کے حملہ آور ہونے کے لیے فضا ہموار ہوتی ہے' میدان ہموار ہو جاتا ہے۔ ثانیاً exciting cause جو مرض کے اُبھرنے کے لیے کوئی فوری سبب بن جاتا ہے۔ یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ یہ مرض کیسے وجود میں آتا ہے۔

اس انداز سے جو جتھے بندی وجود میں آتی ہے اس کا نام ''مظاہرۃ'' ہے۔ یہ مظاہرۃ جسے ہم اسلامی انقلاب کے ضمن میں باطل کے خلاف اقدام کا ایک عنوان تجویز کر رہے ہیں' اگر اس اجتماعیت کے اندر ہونا شروع ہو جائے تو ع ''وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی'' کے مصداق وہ اجتماعیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ گویا دیمک ہے جو اندر سے چٹ کر رہی ہے۔ اس طرح اس کی ساری اجتماعیت اور اجتماعی قوت ختم ہو جائے گی۔ تو یہ مظاہرہ کسی اجتماعیت کے اندر نہ ہو۔

## ''نجویٰ'' کی حقیقت وشناعت۔ قرآن حکیم کی روشنی میں

اب ان آیاتِ مبارکہ کو سمجھ لینا چاہیے جس میں یہ وضاحت ہے کہ اس پوری بیماری کی

، جس کا میں نے اس وقت ذکر کیا ہے' کیا علامات ہیں' اس کا کیسے ظہور ہوتا ہے اور یہ کیسے آگے بڑھتی ہے؟ اس کے لیے ایک عنوان ہے ''نجویٰ''۔ پہلے اس لفظ کی اصل کو سمجھ لیا جائے۔ عربی زبان میں ''نَجْوَۃٌ'' بلندی کو کہتے ہیں۔ اسی سے لفظ نجات بنا ہے جس کے معنی بچ جانے کے ہیں۔ کسی بلند مقام پر پہنچ جانا دشمن کے نرغے سے نکل کر نجات پا جانے کی ایک صورت ہے۔ اس کے لیے بہترین مثال غزوۂ اُحد کی ہے کہ جس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نرغے میں آ گئے اور ستر صحابہ شہید بھی ہو گئے اُس وقت نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ اُحد پہاڑ پر چڑھ جاؤ! چنانچہ بلندی پر چڑھ جانا اُس وقت بچاؤ کی شکل بن گیا۔ تو بلندی پر پہنچ جانا ایک طرح سے بچاؤ' دفاع اور نجات کی ایک شکل بن جاتی ہے۔ پھر یہ کہ بلندی پر کوئی جاتا ہے تو تنہا ہوتا ہے۔ اور یہاں بلندی پر جب تنہائی ہو گی تو وہاں ایک دو جو پہنچ گئے ہیں وہ سرگوشیاں کریں گے جو دوسرے نہیں سنیں گے۔ تو علیحدگی میں خفیہ سرگوشیوں کے لیے یہ لفظ ''نجویٰ'' ہے۔ واضح رہے کہ نجات کا اصل مادہ بھی 'ن ج و' ہے اور نجویٰ کا مادّہ بھی یہی ہے۔

نجویٰ کے ضمن میں ایک آیت سورۃ النساء میں بھی موجود ہے۔ اور میرا گمان ہے کہ سورۃ النساء پہلے اور سورۃ المجادلۃ بعد میں نازل ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔ سورۃ النساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ﴾ (آیت ۱۱۴) ''ان کی سرگوشیوں میں سے اکثر میں کوئی خیر نہیں ہے''۔ یعنی یوں سمجھئے کہ اکثر و بیشتر سرگوشی خرابی کی جڑ بنتی ہے۔ وہی بات بہتر ہوتی ہے جو کھل کر سامنے کی جائے۔ اگر کسی کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ غیبت ہے۔ جیسے اگر کوئی حملہ آور ہونا بھی چاہتا ہے تو بھی سامنے سے حملہ کرے' پیچھے سے حملہ کرنا تو بزدلی ہے۔ اگر سامنے سے حملہ کیا جائے گا تو وہ بھی مدافعت کر سکتا ہے۔ اگر عوام کے اندر اس کو تنقید کا نشانہ بنایا جائے تو اس کو موقع تو ہو گا کہ وہ وضاحت کر کے اپنا دفاع کر سکے کہ یہ بات یوں نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ معاملہ پیچھے سے کیا جائے تو اب وہ مدافعت کے قابل نہیں ہے۔ لہٰذا بات تو وہی ہوتی ہے جو ڈنکے کی چوٹ پر سامنے کی جائے' اِلّا یہ کہ آپ اس طرح اس کے استہزاء کا ذریعہ بن جائیں گے تو اس کی اصلاح کا



امکان کم ہو جائے گا' بلکہ اصلاح کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ یہ مصلحت کی بات ہے۔ ہر چیز کے اندر استثناء تو ہوتا ہے' لیکن قاعدہ قانون یہی ہے کہ ﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ﴾ ''ان کی اکثر سرگوشیوں میں خیر کا کوئی پہلو نہیں ہے''۔ البتہ اس کی کچھ مستثنیات ہیں جو اسی آیت میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہیں:

(i) ﴿اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ﴾ ''سوائے اس کے کہ کوئی (کسی کو) صدقہ کرنے کو کہے''۔ آپ نے کسی کو جا کر مشورہ دیا کہ بھائی فلاں شخص احتیاج میں ہے اور میری اس وقت ایسی حالت نہیں ہے کہ میں اس کی مدد کر سکوں' اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس کی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں' لہٰذا اس کی ضرورت کو پورا کیجیے۔

(ii) ﴿اَوْ مَعْرُوْفٍ﴾ ''یا کوئی نیک کام (کرنے کو کہے)''۔ یعنی کسی اور نیک کام کا کسی کو علیحدگی میں مشورہ دینا۔ محسوس ہو کہ اس کی ہمت کمزور پڑ رہی ہے تو اس کی ہمت بندھانا۔

(iii) ﴿اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ﴾ ''یا لوگوں کو آپس میں صلح کا مشورہ دے''۔ یہ ''اصلاح ذات البین'' ہے کہ لوگوں کے مابین مصالحت کرانا۔ اس کے لیے یہ کرنا پڑے گا کہ آپ علیحدگی میں ایک فریق کی بات سنیں' پھر دوسرے فریق کا موقف سنیں۔ اگر وہ آمنے سامنے ہوں گے تو آپس میں الجھ پڑیں گے' فوراً مشتعل ہو جائیں گے۔ اب آپ علیحدگی میں ایک کی بات سن کر اسے سمجھائیں اور ٹھنڈا کریں۔ پھر دوسرے فریق سے جا کر بات کریں۔ اس معاملے میں یہاں تک اجازت ہے کہ فرض کریں پہلے فریق نے غیظ و غضب کی حالت میں دوسرے فریق کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کیے تو اسے چھپا لیں' اس میں توریہ کی حد تک گنجائش ہے' بلکہ اصلاحِ ذات البین کے لیے اس طرح کی کوئی بات اپنی طرف سے بھی کہی جا سکتی ہے کہ تمہارے لیے اُس کے دل میں محبت ہے' یہ تو وقتی طور پر تمہارے مابین غلط فہمی ہو گئی ہے' کچھ لوگ ہیں جنہوں نے تمہارے مابین عداوت کے بیج بو دیے ہیں۔ دین میں اس کے لیے انتہائی تاکیدی تعلیم دی گئی ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصد بہتری پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ صرف اہلِ ایمان کے لیے نہیں ہے' بلکہ الفاظ آئے ہیں:

﴿اَوْ اِصْلَاحٍ بَیْنَ النَّاسِ﴾ کہ لوگوں کے مابین اصلاح‘ عام انسانوں کے مابین مصالحت کی کوشش۔ سورۃ الحجرات میں تو الفاظ ہیں: ﴿وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ج﴾ (آیت ۹) ’’اور اگر مؤمنوں کے دو گروہ باہم جھگڑا کریں تو ان کے مابین صلح کراؤ‘‘۔ لیکن یہاں الفاظ صرف مؤمنین کے لیے نہیں ہیں‘ بلکہ ’’اصلاح بین النّاس ‘‘ کے الفاظ ہیں۔ اس کے لیے سنن ابی داؤد‘ سنن ترمذی اور مسند احمد میں تاکیدی حدیث موجود ہے کہ یہ کام نماز و روزہ سے افضل ہے کہ لوگوں کے مابین مصالحت کراؤ اور ان کے بگڑے ہوئے تعلقات کو سدھارنے اور سنوارنے کی کوشش کرو۔ تو ان تین کاموں کے لیے علیحدگی میں جا کر سرگوشی کرنا خیر کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی کام کے لیے سرگوشی ہوگی تو اس میں خیر نہیں ہے‘ چاہے آدمی خود کو کتنا ہی دھوکہ دے کہ میں یہ کام نیک نیتی سے کر رہا ہوں‘ بھلائی کے لیے کر رہا ہوں‘ لیکن حقیقتاً وہ خیر سے خالی ہوگا۔ آگے فرمایا: ﴿وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۱۱۴﴾﴾ ’’اور جو شخص یہ کام اللہ کی رضا جوئی کے لیے کرے گا تو ہم اسے عنقریب اجر عظیم سے نوازیں گے‘‘۔

اب آئیے اس پس منظر میں سورۃ المجادلۃ کی آیات پر غور کر لیا جائے۔ فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط﴾ ’’کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے؟‘‘ یہ درحقیقت جانی پہچانی اور تمہاری مانی ہوئی حقیقت ہے جس سے تمہیں اِس وقت ذہول ہو رہا ہے‘ اِس وقت تم اس کو بھلا رہے ہو۔ یہ تمہید ہے کہ کس سے چھپ کر کانا پھوسی کر رہے ہو؟ ایک کان تو ہمیشہ ہر جگہ سننے والا موجود ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ تمہاری ان باتوں کو سننے والا کوئی نہیں ہے۔ اللہ تو سن رہا ہے۔

﴿مَا یَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾ ’’نہیں ہوتا (ان میں سے) کسی بھی تین افراد کا باہم سرگوشی کرنا مگر یہ کہ اللہ اُن کا چوتھا ہوتا ہے‘‘ ﴿وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ﴾ ’’اور نہ پانچ کا (نجویٰ ہوتا ہے) مگر یہ کہ اللہ اُن کا چھٹا ہوتا ہے‘‘ ﴿وَلَا اَدْنٰی



مِنْ ذٰلِكَ﴾ ’’اور نہ اس سے کم‘‘۔ دو بھی باہم سرگوشیاں کر رہے ہیں تو بھی تیسرا اللہ موجود ہے۔ دو سے کم تو نہیں ہو سکتے‘ کیونکہ ایک آدمی تو بیٹھ کر سوچ ہی سکتا ہے۔ ﴿وَلَا اَكْثَرَ﴾ ’’نہ اس سے زائد‘‘ ﴿اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ مَا كَانُوْا ج﴾ ’’مگر یہ کہ اللہ ان کے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی وہ ہوتے ہیں‘‘۔ وہ چاہے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے ہوں‘ یا کھوہ میں چھپ کر مشورے کر رہے ہوں‘ یا کہیں زمین کے پیٹ میں گھس کر یا فضا کی پہنائیوں میں کر رہے ہوں‘ خواہ کہیں بھی ہوں گے اللہ ان کے ساتھ ہے۔ ﴿ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ط﴾ ’’پھر اللہ انہیں قیامت کے دن جتلا دے گا جو وہ کرتے رہے ہوں گے‘‘۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۷﴾﴾ ’’یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے‘‘۔ یہاں نَبَّاَ‘ یُنَبِّئُ کا لفظ ہے۔ اس کے علاوہ نَبَّهَ یُنَبِّهُ کا لفظ آتا ہے جو تنبیہہ کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ متنبہ کرنا۔ جبکہ یہ ’’نَبَأٌ‘‘ سے ہے جس کا مطلب ہے ایک ایک کر کے جتلا دینا کہ تم نے فلاں تاریخ‘ فلاں وقت یہ مشورے کیے‘ یہ ہے تمہارا نجویٰ۔

آگے فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰی ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ﴾[1] ’’کیا تم نے اُن لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنہیں نجویٰ سے روکا گیا تھا؟ پھر بھی وہ وہی حرکت کیے جاتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا‘‘۔ دیکھئے وہ روکنے کا بہترین اور لطیف ترین انداز تھا۔ اس میں ڈانٹ ڈپٹ‘ سختی اور گرفت کا انداز نہیں تھا‘ بالکل ایسے جیسے کوئی کائناتی حقیقت بیان کی جا رہی ہو کہ: ﴿لَا خَیْرَ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَیْنَ النَّاسِ ط﴾ یعنی جان لو اِن تین کاموں کے سوا جو کچھ ہے اس میں خیر نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے جن کے دلوں میں اصلاح پذیری کا مادہ تھا وہ اگر غیر شعوری طور پر یہ کام کر رہے تھے تو اب شعوری طور پر رُک گئے‘ ٹھٹک گئے‘ انہوں نے اپنی باگیں کھینچ لیں۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں روگ یا مرض ہوتا ہے تو ﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ

(۱) اس آیت سے بھی میرا گمان ہے کہ سورۃ النساء‘ سورۃ المجادلہ سے پہلے نازل ہوئی ہے‘ کیونکہ اس مقام کے علاوہ قرآن مجید میں نجویٰ کے بارے میں صرف سورۃ النساء کی ایک آیت ہے۔ تو محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اُس آیت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔

مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ کے مصداق اُن کا روگ تو مسلسل بڑھتا ہے۔ اب یہاں اُن کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ یہ اُس معاشرے میں وہ لوگ تھے جنہیں آج ہم منافقین کہتے ہیں۔ لیکن ان کی پیشانیوں پر لکھا ہوا نہیں تھا کہ یہ منافق ہیں، بلکہ وہ مسلمان ہی سمجھے جاتے تھے۔ حضور ﷺ کے علم میں تھا کہ کون منافقین ہیں، لیکن حضور ﷺ نے اسے ایک راز ہی رکھا ہے۔ اپنے ایک صحابی ؓ کو اگر چند خاص منافقین کا نام بتا بھی دیا تھا تو انہیں بھی آگے بیان کرنے سے سختی سے روک دیا تھا کہ یہ ایک راز ہے۔ لہٰذا وہ مسلمانوں میں گڈمڈ تھے۔ اس اعتبار سے یہ نہ سمجھئے کہ اس کا ہم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اصل میں تو قرآن مجید میں جو بھی منافقین کا بیان ہے ہم اس سے اس وجہ سے محروم رہتے ہیں کہ ہم انہیں ایک علیحدہ category قرار دے کر سمجھتے ہیں کہ ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ تو یہ سمجھئے کہ یہ درحقیقت ہمیشہ مسلمانوں میں گڈمڈ ہوتے ہیں۔ یہ بہتر سے بہتر جماعت میں موجود تھے۔ صحابہ کرام ؓ کی جماعت سے تو بہتر جماعت نہیں ہو سکتی، اس میں یہ ففتھ کالمسٹ عنصر موجود تھا۔ غور کیجیے کہ تا بہ دیگراں چہ رسد؟ کون سی جماعت یہ سمجھ سکتی ہے کہ ہم اس سے بالاتر ہیں، منزّہ اور پاک ہیں!

﴿وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ﴾ ''اور یہ لوگ چھپ چھپ کر آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں کرتے ہیں''۔ یعنی مندرجہ بالا تین چیزوں کے مقابلے میں یہ جو نجویٰ کرتے ہیں، سرگوشیاں اور کھسر پھسر کرتے ہیں، وہ ایک تو گناہ کے لیے ہوتا ہے۔ لفظ 'اِثْم'' کا ترجمہ ہم ''گناہ'' کرتے ہیں اور ''عُدوان'' کا ترجمہ ''زیادتی''۔ اصل میں گناہ کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک ہے کوتاہی، یعنی آپ اپنا فرض ادا نہیں کر رہے۔ اور دوسرا ہے زیادتی، کہ کسی کے حق پر دست درازی کرنا، حملہ آور ہونا۔ یہ دو پہلو علیحدہ ہیں۔ لہٰذا اگر آپ ایمان کا تقاضا پورا نہیں کر رہے تو یہ 'اِثْم' ہے۔ اہل عرب اس اونٹنی کو ''آثِمَۃٌ'' کہتے ہیں جو قافلے سے پیچھے رہ گئی ہو۔ اگر کوئی اونٹنی قافلے میں موجود تمام اونٹوں اور اونٹنیوں کے ساتھ ساتھ چلے گی تب ہی وہ قافلہ بنے گی، ورنہ تو وہ قافلے سے پیچھے رہ جائے گی اور اب وہ 'آثمۃ' کہلائے گی۔



اب یوں سمجھئے کہ جن فرائض کی ادائیگی کے لیے کوئی اجتماعی نظام قائم ہوا ہے، جو لوگ ان فرائض کو بحسن و خوبی ادا کر رہے ہوں وہ تو گویا قافلے کے ساتھ چل رہے ہیں، جبکہ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو پیچھے ہوتے ہیں اور اپنے ان تقاضوں کو پورا نہیں کر پا رہے ہوتے۔ تو یہ 'اِثْم' ہے۔ ایسے آدمی کی عزتِ نفس اسے ابھارتی ہے کہ دیکھو ایسا دُم کٹا کوئی اور بھی ہے یا نہیں! تو جن کے اندر کسل ہوتا ہے ان کے مابین یگانگت (affinity) پیدا ہو جاتی ہے اور وہ پیچھے رہ جانے والے خود بخود ایک دوسرے کی طرف ایک میلان محسوس کرنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے جواز فراہم کرتے ہیں۔ تو اس کا پہلا عنوان ہے ﴿يَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ﴾ 'اِثم' کے معنی روکنے کے بھی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کی خیر خواہی کے انداز میں کہتے ہیں کہ بے وقوف نہ بنو، یہ تو پاگل ہیں، لیکن ہمیں تو دیکھ کر چلنا ہے اور انہیں بھی سمجھانا ہے۔ جیسے اُس دَور کے منافقین کہا کرتے تھے: ﴿اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۳) ''کیا ہم ایمان لے آئیں ان بے وقوفوں کی طرح؟'' انہیں تو کسی خیر و شر اور نفع و نقصان کی فکر نہیں ہے۔ یہ تو دیوانے (fanatics) ہو گئے ہیں۔ تو اب اس طرح کی گفتگو ہوگی۔ ﴿وَالْعُدْوَانِ﴾ ''اور زیادتی کے لیے (سرگوشیاں کرتے ہیں)''۔ یہ دوسرا رُخ ہے کہ کسی کی عزت پر حملہ کرنا، کسی کے حقوق پر دست درازی۔

﴿وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ﴾ ''اور رسولؐ کی نافرمانی کے لیے (سرگوشیاں کرتے ہیں)''۔ یہاں رسول کی حیثیت ذہن میں رکھئے! رسول کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔ رسول کی ایک حیثیت اس جماعت کے امیر کی بھی ہے اور رسول کی ایک حیثیت اس ریاست کے سربراہ کی بھی ہے۔ یہ ایسا معاملہ ہے جو زیادہ کٹھن گزرتا ہے۔ میرے نزدیک نفاق کے موضوع پر سورۃ النساء قرآن مجید میں اصولی طور پر اہم ترین سورت ہے۔ اب جو چیزیں نفاق کا اصل سبب بنتی تھیں ان میں سے ایک اہم چیز ''رسول کی اطاعت'' تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ رسول بھی تو آخر ہمارے جیسے انسان ہیں۔ بس ان پر وحی اترتی ہے جسے ہم تسلیم کرتے ہیں۔ باقی تو یہ ہمارے جیسے انسان ہیں، ہم کیسے ان کے آگے سر جھکائیں! کیا ان سے خطا نہیں ہو سکتی؟ کیا ہماری بات بہتر نہیں ہو سکتی؟ ہمیں تجربہ

حاصل ہے‘ ہم جانتے ہیں‘ ہم معاملات کو چلاتے رہے ہیں۔ انہیں تو کوئی تجربہ نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہی جاتی تھیں۔ یہ ہے معصیت رسول‘ رسول کے حکم سے سرتابی۔ منافقین کی علامتیں اور ان کے مشاغل قرآن مجید میں کئی جگہ مذکور ہیں۔ انہیں حضور ﷺ سے جو کدّ ہو گئی تھی اس کا ظہور مختلف طریقوں سے ہوتا تھا۔

آگے فرمایا: ﴿ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ﴾ ”اور جب یہ آپؐ کی خدمت میں آتے ہیں تو آپ کو وہ دعا دیتے ہیں جو اللہ نے آپ کو نہیں دی“۔ عربوں کا ایک عام دعائیہ کلمہ ”حَيَّاكَ اللّٰهُ“ ہے جس کے معنی ہیں ”اللہ تمہاری عمر دراز کرے“۔ یہیں سے لفظ ”تَحِيَّة“ بنا ہے جو اپنے نیک جذبات کا اظہار ہے۔ اسے آپ greetings کہتے ہیں۔ اصل سلام تو ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ“ ہے‘ لیکن منافقین ”السَّام علیکم“ کہتے تھے‘ جس کے معنی ہیں ”تم پر موت آئے“۔ (معاذ اللہ۔ نقل کفر کفر نباشد!) اگر کوئی پکڑ لیتا تو کہنے لگتے کہ ہم نے تو السلام علیکم کہا ہے‘ شاید آپ کو ٹھیک سنائی نہیں دیا‘ ذرا اپنے کان کی میل نکلوائیے اور اس میں تیل ڈلوائیے! الٹا اسے شرمندہ کر دیتے۔

﴿ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ ﴾ ”اور وہ اپنے جی میں کہتے اللہ ہمیں سزا کیوں نہیں دیتا اُس پر جو ہم کہتے ہیں“۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ میں مثال آئی ہے کہ ”رَاعِنَا“ کے بجائے ”رَاعِيْنَا“ کہتے‘ یعنی ”اے ہمارے چرواہے!“ ”رَاعِنَا“ ایک مجلسی کلمہ تھا کہ ہماری طرف ذرا متوجہ ہوں‘ ہمارا لحاظ کیجیے‘ ہم بات سمجھ نہیں سکے۔ جیسے ”pardon“ کا لفظ عام طور پر بولا جاتا ہے کہ معاف کیجیے گا۔ لیکن وہ ”رَاعِيْنَا“ کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔ اور شیطان کا وسوسہ دیکھئے: ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ ﴾ ”اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہماری ان باتوں پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا؟“ یعنی شیطان اب اور پٹی پڑھا رہا ہے کہ دیکھو تم نے رسول (ﷺ) سے گستاخی کی۔ اگر یہ رسول ہوتے تو اللہ تمہاری زبان گدی سے کھینچ لیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا شک و شبہ صحیح ہے۔ یہ ہے وہ برائی کا چکر (wicious circle) یعنی ایک برائی دوسری برائی کو جنم دیتی ہے اور دوسری پہلی برائی کو مزید تقویت



دیتی ہے کہ دیکھو بھائی میں نے تو اُس وقت اتنا کلام کر دیا‘ اب اگر فی الواقع یہ رسول ہوتے تو کیا اللہ اس کو گوارا کرتا! کیوں نہیں اللہ اس پر ہمیں عذاب دیتا جو ہم کہہ رہے ہیں! اس کا مطلب صاف ہے کہ یہ رسول نہیں ہیں اور ہمارا شبہ صحیح ہے۔ فرمایا: ﴿ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ ﴾ ”ان کا ٹھکانہ جہنم ہے جس میں یہ پہنچ کر رہیں گے (جھونکے جائیں گے)“ ﴿ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۸ ﴾ ”اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے“۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ﴾ ”اے اہل ایمان! جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں نہ کرو“۔ یعنی اگر تمہیں نجویٰ کرنا ہی ہے‘ تنہائی میں گفتگو کرنی ہی ہے‘ کوئی مل بیٹھنے کا موقع آ ہی گیا ہے تو ان تین چیزوں سے بچو: (i) اثم‘ (ii) عدوان‘ (iii) معصیت رسول۔ ﴿ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۭ ﴾ ”اور باہم تنہائی میں نیکی اور تقویٰ کی باتیں کرو“۔ اگر نجویٰ کرنا ہی ہے تو نیکی اور تقویٰ کے لیے کرو‘ خیر اور بھلائی کے لیے کرو‘ ایک دوسرے کو نیکی پر آمادہ کرو‘ ایک دوسرے کی طبیعت میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے تو اس کو دور کرو‘ دوسرے کی ہمت اگر پست ہو رہی ہے تو اسے ہمت دلاؤ۔ لیکن اثم‘ عدوان اور معصیت رسول سے بچو۔ ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۹ ﴾ ”اور تقویٰ اختیار کرو اس اللہ کا جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے“۔

﴿ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ ﴾ ”جان لو کہ کانا پھوسی تو ایک شیطانی کام ہے“۔ آج میں نے وہیں سے بات شروع کی ہے کہ جو اجتماعیت دین کا بول بالا کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے تو شیطان کو سب سے بڑھ کر تکلیف لازماً اسی سے ہو گی‘ چنانچہ وہ اپنی توجہات سب سے زیادہ اسی پر مرکوز کرے گا۔ ﴿ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ ” (اور یہ اس لیے کیا جاتا ہے) تاکہ اہل ایمان کو غم ہو“‘ اندوہ ہو‘ رنج و صدمہ ہو‘ ان کی یکسوئی اور یک جہتی مجروح ہو‘ ان کے دلوں میں خلجان پیدا ہو جائے۔ یہ ہے جس کے لیے شیطان نجویٰ کا جال بچھاتا ہے اور اس کے اندر اس نے بڑی خوش نمائی پیدا کر دی ہے۔ ﴿ وَلَيْسَ بِضَاۗرِّهِمْ شَـيْـــًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ﴾ ”حالانکہ اذنِ خدا کے بغیر وہ (نجویٰ) انہیں کچھ بھی نقصان نہیں

پہنچا سکتا''۔اب یہ اہل ایمان کو اطمینان دلانے کے لیے فرمایا جارہا ہے کہ مطمئن رہو، تمہیں اللہ کے اِذن کے بغیر کوئی کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔جیسے ہم کہتے ہیں: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔شیطان کو ہرگز کوئی اختیار حاصل نہیں ہے' اگر اس کا کوئی وار کارگر ہوتا بھی ہے تو وہ بھی اذنِ ربّ سے ہوتا ہے' اس میں بھی اللہ کی طرف سے کوئی خیر ہوتا ہے' کوئی تمہاری تربیت یا اصلاح مقصود ہوتی ہے' اللہ اسے تمہاری اصلاح کا بہانہ بناتا ہے۔﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ''اور اہل ایمان کو تو اللہ پر اپنا پورا توکل اور بھروسہ کرنا چاہیے''۔اطمینان دلایا جارہا ہے کہ اس میں زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔حتی الامکان سدّ باب کرو' لیکن جس شخص کا معاملہ اللہ کے ساتھ صاف ہے اسے ان چیزوں سے زیادہ دل گیر اور دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے۔البتہ ان تمام مفاسد سے اس ہیئت اجتماعیہ کو پاک کرنے کی کوشش کرنا بالکل دوسری بات ہے۔

چونکہ میں نے پس منظر بیان کر دیا ہے اس لیے آپ کو یہ بات سمجھنے میں کافی سہولت ہو جائے گی۔فرمایا:﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ''اے اہل ایمان! جب تم سے کہا جائے کہ مجالس میں کشادگی پیدا کرو تو کھل کر بیٹھا کرو' اللہ تمہارے لیے کشادگی پیدا کرے گا''۔بڑا پیارا ربط ہے۔یہ ایک فطری بات ہے کہ جو تین چار آدمی علیحدگی میں آپس میں ملاقاتیں کرتے ہیں اور باہم سرگوشیاں کرتے ہیں وہ جب کسی اجتماع میں آئیں گے تو بھی اکٹھے بیٹھیں گے اور علیحدگی میں کھسر پھسر اور سرگوشیاں کریں گے' کن انکھیوں میں تبادلۂ خیال کریں گے جو بہت خطرناک ہے۔تب ہی تو کہا جارہا ہے کہ جب تم سے کھل کر بیٹھنے کو کہا جائے تو کھل کر بیٹھ جایا کرو' اللہ تمہارے لیے کشادگی پیدا کرے گا۔یوں سمجھئے اس نجویٰ کا ظہور اب مسلمانوں کے اجتماعات کے اندر ہونے لگا تھا جس کے لیے کہا جاتا تھا کہ کھل کر بیٹھو' تاکہ آپ کے مابین جگہ ہو اور کوئی اور آنے والا بیٹھ سکے۔منافقین اس طریقے سے جتھہ بندی کرتے تھے کہ ان کے مابین کوئی تیسرا آدمی نہ بیٹھ جائے' کیونکہ اگر ان میں کوئی باہر کا آدمی شامل ہو گیا تو وہ ان کی رپورٹ کرے گا اور یوں ان کی باتیں دوسروں کے علم میں آجائیں



گی۔لہٰذا کہا جارہا ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کشادگی پیدا کرے گا اور تنگیوں سے جو فساد پیدا ہو رہا ہے اس کی روک تھام کی جا سکے گی۔

﴿وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا﴾ ''اور جب کہا جائے کہ اُٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو''۔ یہ اب ان کے نجویٰ کی تیسری شکل ہوتی ہے۔اجتماع اختتام پذیر ہو جائے اور کہہ دیا جائے کہ اب آپ تشریف لے جائیے تو ان لوگوں کا نجویٰ فوراً وہیں شروع ہو جاتا ہے۔کچھ دیر اطمینان سے بیٹھے رہتے ہیں' تاکہ دورانِ اجتماع اگر کوئی تبصرے نہیں ہو سکے تو تبادلۂ خیال کر لیں اور ایک دوسرے کو فقرے بازیوں پر داد دے لیں۔لہٰذا وہ وہاں سے فوراً روانہ نہیں ہوتے۔اس لیے اہل ایمان سے کہا جارہا ہے کہ اگر تمہیں کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔

﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ ''تم میں سے جو لوگ واقعی اہل ایمان ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے' اللہ ان کے درجات بلند کرے گا''۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر صنعتِ لفظی کا ایک خوبصورت انداز ہے۔یہ بھی کلام کا ایک حسن ہے۔کہا جارہا ہے کہ اے اہل ایمان! جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو' اللہ تمہیں اونچا کرے گا۔اگر تم خلوص و اخلاص کے ساتھ احکام مانو گے تو اللہ تمہیں رفعت عطا فرمائے گا۔

اس ضمن میں بعض حضرات نے بڑی عمدہ بات کہی ہے۔بعض اوقات کسی اجتماع میں یہ صورت پیش آتی ہے کہ دو حضرات آپس میں سرگوشی کر رہے ہیں' جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ یہاں سے اُٹھ کر وہاں بیٹھئے تو اس میں آدمی اُس وقت اپنی توہین محسوس کرتا ہے' حالانکہ سوچنا چاہیے کہ کوئی شخص ہے جو اِس اجتماع کو conduct کر رہا ہے اور اس کی نگاہ میں یہ بات آ گئی ہے' لہٰذا وہ اس اجتماع کی تاثیر کو ختم کرنے والی شے کو رفع کرنا چاہتا ہے تو اس میں انسان اپنی توہین محسوس نہ کرے۔اس لیے کہ جو صاحبِ امر اور ذمہ دار ہے اسے اس کا نظم چلانا ہے' اسے اس اجتماع کو بہتر سے بہتر نتیجے تک منتج کرنا ہے' نتیجہ خیز اور بار آور بنانا ہے' لہٰذا اگر کہہ دیا جائے کہ اٹھ جائیے یا یہ کہ فلاں جگہ پر تشریف لے جائیے تو اس پر

براانہیں ماننا چاہیے۔ بہرحال جو صاحب علم ہوگا اور جس کے دل میں ایمان کی رمق ہوگی وہ اسے خیر سمجھے گا اور اس ہدایت پر عمل اپنی توہین نہیں سمجھے گا' تو اللہ اس کے درجات بلند کرے گا' لیکن جس کے دل میں روگ ہو وہ اسے برا مانے گا کہ اسے نمایاں کر کے سب کے سامنے ذلیل کر دیا گیا ہے' جبکہ یہ کام اس کے بجائے کوئی دوسرا کر رہا تھا اور دوسرے کا وبال اس پر آ گیا ہے۔ حالانکہ اسے سوچنا چاہیے کہ اگر وہ اس غلطی کا ارتکاب نہیں کر رہا تھا اور غلطی سے اسے اٹھ جانے کو کہہ دیا گیا ہے تو کون سی قیامت آ گئی ہے! اگر اس کام کی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے مثبت انداز میں سوچا جائے پھر تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ ٹھیک ہے وہ صاحبِ نظم ہے' اس سے غلطی ہو بھی گئی ہے تب بھی کسی کی کوئی توہین نہیں ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ حساسیت انہی لوگوں کو ہوتی ہے جن کے دل میں کچھ کبر اور فساد ہوتا ہے۔ جیسے کہا گیا ہے: ﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ ورنہ انسان سوچے گا کہ اگر میرا قصور نہیں بھی تھا' بلکہ کچھ زیادتی ہو گئی ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے اس کا کوئی نہ کوئی اجر عطا فرمائے گا' تلافی (compensate) کرے گا' اگر صاحب امر نے زیادتی کی ہے تو اس کی کوئی نیکی مجھے مل جائے گی' لہٰذا مجھے تو کوئی نقصان نہیں ہے' میرے لیے تو بس حصول ہی حصول ہے۔ یہ تب ہوتا ہے جب ایمان اور خلوص و اخلاص ہو' اور اس اجتماعیت سے مخلصانہ تعلق ہو۔ ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے''۔

اس میں ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ جو شخص کسی اجتماعی جدوجہد میں شریک نہیں ہے تو قرآن مجید کی یہ باتیں اسے کس طرح سمجھ میں آئیں گی! ان کا محض ترجمہ تو کیا جا سکتا ہے مگر اِن کی اہمیت و عظمت اسی صورت میں سمجھ آ سکتی ہے جب کسی اجتماعیت میں شریک ہوا جائے' ورنہ تو لوگ سمجھیں گے کہ ٹھیک ہے یہ اللہ کا کلام ہے اور ہم نے اسے پڑھ کر ثواب حاصل کر لیا ہے۔ لیکن یہ کہ ان باتوں میں کیا حکمتیں ہیں اور ان میں ہمارے لیے کیا ہدایات مضمر ہیں' یہ حقیقت اسی وقت ابھر کر اور نکھر کر سامنے آئے گی جب مقصد زندگی اقامت دین معین ہو چکا ہو' جس کے بارے میں ارشاد ہے:



﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ﴾ (الحدید: ۲۵)

''تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں' اور ہم نے لوہا اتارا جس میں لڑائی کی سخت قوت ہے اور لوگوں کے لیے دوسرے فوائد بھی ہیں' اور (اس لیے بھی) تاکہ اللہ تعالیٰ ظاہر کر دے اس کو جو مدد کرتا ہے اللہ کی اور اس کے رسول کی غیب میں رہتے ہوئے''۔

اقامتِ دین کے لیے جو اجتماعیت قائم ہوئی ہے اس کی مصلحتیں اور اس کا تحفظ اللہ کی نگاہ میں کتنا عزیز ہے' یہ وہ بات ہے جو سمجھ میں آئے گی تو ہی اس کی اہمیت و عظمت منکشف ہو گی۔

ایک اور مسئلہ بھی ہے جو اجتماعی زندگی کا بڑا اہم مسئلہ ہے' ہر صاحبِ امر کو اِس سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ اوّل تو ہر شخص فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ اسے صاحب امر سے قرب ہو' اس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملے' یہ فطری اور اچھی بات ہے' اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ لیکن اس کا ایک منفی رُخ بھی ہے' کہ کچھ لوگ کام میں تو پیچھے ہوتے ہیں' لیکن اپنی دولت یا وجاہت دُنیوی کی وجہ سے کچھ نمایاں ہوتے ہیں اور وہ اپنی اس دُنیوی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے صاحبِ امر کے قریب ہو کر بیٹھتے ہیں اور کان میں گفتگو کرتے ہیں' تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ ان سے بہت قریب ہیں' امیر ان کی بڑی رعایت کرتے ہیں اور بڑا لحاظ کرتے ہیں۔ وہ اس کے لیے اپنی حیثیت کو ذریعہ بناتے ہیں۔ سوچیے کہ امیر کے پاس تو وقت محدود ہے اور اجتماعیت کے حقوق بھی اس پر ہیں' تو جب اس کے وقت میں اس طرح سے دخل اندازی ہوتی ہے تو اس کا اجتماعیت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس بات کی قباحت کو تین درجات میں سمجھ لیجیے۔ یہ فطری خواہش ہوتی ہے اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے' لیکن مفسدین اسی چیز سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنے مقام و مرتبہ کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عبداللہ بن اُبی خاص طور پر ایسا کرتا تھا۔ ویسے بھی وہ قبیلۂ خزرج کا سردار تھا' رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے قبل اس کی بادشاہت کا فیصلہ

ہو چکا تھا۔ جب حضور ﷺ کو خطبہ ارشاد فرمانا ہوتا تو پہلے وہ کھڑا ہوتا تھا اور لوگوں سے کہتا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں' ان کی بات پوری توجہ سے سنیے۔ اصل مقصد اپنی حیثیت اور سرداری کو نمایاں کرنا ہوتا تھا۔ اگر کوئی شخص امیر سے کہتا ہے کہ مجھے آپ سے تخلیے میں گفتگو کرنی ہے تو لوگوں کے سامنے آئے گا کہ یہ امیر سے بہت قریب ہیں اور ان کی رائے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے' تبھی تو جب دیکھو یہ علیحدگی میں بات کرنے کے لیے وقت مانگ رہے ہوتے ہیں اور انہیں وقت دیا جاتا ہے۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو وقت اجتماعی مصالح اور بہبود پر صرف ہونا ہو وہ اس طریقے سے ضائع ہو جاتا ہے۔ آخر انسان کی صلاحیت اور قوتِ کار محدود ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کا معاملہ یہ تھا کہ آپؐ شرافت اور مروّت کا پیکرِ مجسم تھے' سب کچھ معلوم ہوتے ہوئے بھی آپ زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ جیسے سورۃ الاحزاب میں آیا ہے کہ حضور ﷺ اہل ایمان کو کھانے کی دعوت دیتے تو کچھ لوگ بہت پہلے پہنچ جاتے' اب دھرنا مار کر بیٹھے ہوئے ہیں' جبکہ ابھی کھانا پکنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ پھر کھانا کھانے کے بعد بھی بیٹھے رہتے تھے۔ اس میں دونوں طرح کی باتیں ہو سکتی ہیں۔ اس میں مخلصین کے لیے تو یہ پہلو تھا کہ حضور ﷺ سے قرب کا موقع مل جاتا۔ اور جو حضور ﷺ کو تنگ کرنے والے تھے وہ اس کے ذریعے سے حضور ﷺ کو تنگ کرتے تھے' آپؐ کی privacy میں مخل ہوتے تھے اور جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔ لہٰذا فرمایا گیا کہ نہ پہلے آ جایا کرو اور نہ بعد میں بیٹھے رہا کرو۔ ﴿مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ﴾ کے الفاظ ہیں کہ کھانے کے بعد باتوں میں نہ مشغول ہو جایا کرو۔ یہ چیز نبی اکرم ﷺ کو تکلیف دیتی ہے' لیکن وہ چونکہ حیا کا پیکر ہیں اس لیے وہ تم سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ ذکر قرآن میں ہے۔ اسی طرح اس معاملے میں کوئی تخلیے میں بات کرنے کے لیے وقت مانگ رہا ہے' تو اب وہ کس کس کو وقت دیں! جبکہ وہ انکار کسی کو نہیں کر رہے۔ اس کا تیسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کسی کے پاس واقعی کوئی اہم بات ہو تو وہ رہ جاتی ہے۔ یہ ساری چیزیں عملی ہیں۔ اور یہ باتیں اس وقت سمجھ میں آتی ہیں جب انسان پر بیتتی ہے اور ان کا تجربہ ہوتا ہے' ورنہ تو معلوم ہوگا کہ' معاذ اللہ' اس کی کوئی خاص عملی اہمیت نہیں ہے۔



اس چیز کی روک تھام کے لیے اب فرمایا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ﴾ ''اے اہل ایمان! جب تم رسول سے علیحدگی میں کوئی بات کرو (تمہیں تخلیے میں کوئی بات کرنی ہو) تو اس سے پہلے (اللہ کے راستے میں) کچھ صدقہ دے دیا کرو''۔ یہ گویا فیس لگا دی گئی ہے۔ اور یہ فیس حضور ﷺ کو نہیں ملے گی (معاذ اللہ)' بلکہ یہ صدقہ ہے' تا کہ کچھ تو بریک لگے۔ منافقین کو تو مال بہت مرغوب اور محبوب تھا' اور وہی نفاق کی جڑ ہے' تو یہ ایک چھلنی تو لگ جائے گی کہ کوئی صدقہ دے کر پھر علیحدگی میں کوئی بات کرے۔ ﴿ذٰلِكَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ﴾ ''یہی تمہارے لیے بہتر ہے اور پاکیزگی کے اعتبار سے بڑھ کر ہے''۔ ﴿فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۲﴾ ''پھر اگر کچھ بھی نہ پاؤ تو یقیناً اللہ غفور ہے رحیم ہے''۔ اگر کوئی نادار ہے اور اس کے پاس کچھ نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن ان ناداروں میں تو وہ منافقین تھے ہی نہیں۔ حضور ﷺ سے جو خصوصی کھسر پھسر کرنا چاہتے تھے وہ تو وہاں کے سردار اور صاحب ثروت و وجاہت لوگ تھے۔ لہٰذا مساکین اور غرباء کے لیے راستہ کھلا رکھا گیا کہ اگر کسی کے پاس صدقہ کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے تو کوئی پروا نہیں۔ اصل مقصد تو اس غلط طرزِ عمل کی روک تھام تھا' جس کے لیے یہ چھلنی لگائی گئی ہے۔

﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ﴾ ''کیا تم اس سے ڈر گئے ہو کہ تم (اپنے رسولؐ سے) تخلیہ میں گفتگو سے پہلے صدقات دیا کرو؟'' گھبرا گئے ہو اس سے؟ ﴿فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا﴾ ''تو اب جبکہ تم نے یہ نہیں کیا''۔ یہ مشکلات القرآن میں سے ہے۔ بعض حضرات نے سمجھا ہے کہ یہ کسی نے بھی نہیں کیا۔ اور ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس حکم پر عمل کرنے والا سب سے پہلا شخص میں ہی تھا' مجھے حضور ﷺ سے علیحدگی میں کوئی بات کرنا تھی تو میں نے پہلے صدقہ دیا پھر گفتگو کی۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ یہ حکم صرف چند گھنٹے کے لیے تھا' اس کے بعد یہ آیت جو اَب ہم پڑھ رہے ہیں' نازل ہو گئی تھی۔ لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی' بلکہ اس میں کچھ نہ کچھ وقت لگا ہوگا۔ قرآن مجید میں اس کی مثالیں ہیں کہ بسا اوقات ناسخ و منسوخ دونوں ساتھ ساتھ

رکھ دیے گئے ہیں۔ سورۃ المزمل میں اس کی سب سے بڑی مثال موجود ہے کہ آخری آیت جس پر دوسرا رکوع مشتمل ہے' وہ کچھ عرصہ کے بعد نازل ہوئی۔ ہمارے یہاں اس بارے میں اختلافِ روایات ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ایک سال بعد نازل ہوئی اور بعض حضرات اسے مدنی بھی مانتے ہیں۔ گویا کہ پہلے اور دوسرے رکوع کے مابین دس سے بارہ سال کا فصل ہے' لیکن مصحف میں وہ ساتھ ساتھ ہیں۔ یہی صورت حال سورۃ البقرۃ کے رکوع ۲۳ میں روزہ کے حکم کے بارے میں ہے' جسے اکثر لوگوں نے چونکہ اس پس منظر میں نہیں سمجھا اس لیے بہت سی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ وہی معاملہ یہاں بھی ہے۔ کچھ نہ کچھ فصل تو اس میں یقیناً ہوگا۔

یہاں ﴿ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا ﴾ میں یہ اشارہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم اب اس غلط حرکت سے باز آ گئے ہو اور جو اِس عارضی حکم کا مقصد تھا وہ حاصل ہو چکا۔ بہرحال اس کا ایک ترجمہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ تم نے صدقہ نہیں دیا اور ڈر کر حضور ﷺ سے خلوت میں بات کرنا چھوڑ دی۔ اور ایک ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جبکہ تم نے اس بے احتیاطی کو ترک کر دیا تو جو ضرورت تھی وہ ختم ہوگئی' لہٰذا اب ہم اپنے اس حکم کو منسوخ کر رہے ہیں۔ ﴿وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ﴾ ''اور اللہ نے (عنایت کے ساتھ) تم پر توجہ فرمائی''۔ یعنی نظرِ عنایت کی۔ اللہ کی توبہ بندوں پر شفقت و رحمت کی نگاہ کرنا ہے۔ اللہ نے تم پر رحم فرمایا' مہربانی کی۔ ﴿فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ﴾ ''تو نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی''۔ یعنی جو مطلوب شے ہے وہ یہ ہے کہ اس نظم کو مضبوط کرو۔ اس کے لیے نماز اللہ کے ساتھ تمہارے تعلق کو مضبوط کرنے والی شے ہے۔ اب تم اس نظم اور ڈسپلن کو مضبوط رکھو۔ یہ ڈسپلن فی ذاتہٖ مطلوب نہیں ہے' یہ ایک عظیم مقصد کے لیے مطلوب ہے۔ اور جسے وہ مقصد عزیز ہوگا وہ اس نظم کی امکانی حد تک حفاظت کرے گا' اسے مضبوط رکھے گا' اس میں رخنوں کو روکنے کی امکانی کوشش کرے گا۔ ﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٣﴾﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے''۔

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم

☆ —— ☆ —— ☆



# نظمِ جماعت کی پابندی

## اور

## اس سے رخصت اور معذرت کا معاملہ

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعدُ :

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٢﴾ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦٣﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٤﴾﴾ (النور)

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٤٣﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٤﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ

قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿٤٦﴾ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَاوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٧﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٩﴾ (التوبۃ)......صدق اللہ العظیم

ہمارے اس منتخب نصاب (۲) میں جو امور زیر بحث آئے ہیں ان سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ایک اسلامی نظمِ جماعت میں مأمورین کو امراء کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ ان میں آداب اور قواعد وضوابط بھی ہیں اور اصلاً اس اجتماعیت کی روحِ رواں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جہاں تک رخصتوں اور معذرتوں کا معاملہ ہے' اس ضمن میں سورۃ النور کی آخری آیات (۶۲ تا ۶۴) اور سورۃ التوبۃ کی آیات (۴۳ تا ۴۹) میں بظاہر ایک تضاد سامنے آتا ہے۔ اس تضاد کو رفع کرنا اور ان دونوں میں تطبیق کا جاننا ضروری ہے۔

سورۃ النور کی آخری تین آیات (۶۲ تا ۶۴) کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ کس قدر باریک بینی سے ان امور کی طرف رہنمائی کی جا رہی ہے جن پر کسی اجتماعیت میں ایک عمدہ ماحول اور باہمی اعتماد کی فضا برقرار رہ سکتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓي اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ﴾ ''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر' اور جب وہ ان (ﷺ) کے ساتھ کسی اجتماعی کام میں ہوتے ہیں تو وہ وہاں سے ہرگز نہیں جاتے یہاں تک کہ اُنؐ سے اجازت حاصل کر لیں''۔ یہاں نوٹ کیجیے کہ ''اِنَّمَا'' کلمۂ حصر ہے۔ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کا اسلوب بھی یہی ہے اور وہاں بھی ایمانِ حقیقی کی دو شرائط یا دو لوازم



بیان ہوئے ہیں — ایک اللہ اور اس کے رسول پر ایمان اور دوسرے اللہ کی راہ میں مال اور جان کے ذریعے جہاد۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿١٥﴾﴾

''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر' پھر شک میں نہیں پڑے اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ وہی لوگ ہیں سچے''۔

ان دو اجزاء میں سے ایک یہاں (سورۃ النور میں) بھی جوں کا توں موجود ہے' یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان۔ دوسرا جزو وہاں جہاد فی سبیل اللہ بالمال والنفس ہے' جبکہ یہاں اس کی جگہ اس کے لازمی تقاضے کے طور پر اجتماعیت کا ایک وصف لایا گیا ہے' کیونکہ جہاد ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ ایک اجتماعیت موجود نہ ہو۔ یہاں یہ ذہن میں رکھئے کہ نبی اکرم ﷺ کی یہاں کون سی حیثیت مراد ہے؟ امیر یا سپہ سالار ہونے کی حیثیت! کیونکہ اگر آپؐ مدینہ میں ہیں تو سربراہِ مملکت ہیں' اگر کسی غزوہ پر تشریف لے گئے ہیں تو آپؐ کی حیثیت سپہ سالار کی ہے۔ جب تک آپؐ مکہ مکرمہ میں تھے آپؐ ایک جماعت کے امیر تھے۔ آپ ﷺ کی ان تمام حیثیتوں سے بالاتر اور عظیم ترین حیثیت یہ ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ باقی تمام حیثیتیں اس کے تابع ہیں۔ لیکن ہر جگہ اس حیثیت کو علیحدہ سمجھ لینا چاہیے جس حیثیت کا ذکر اُس خاص مقام پر ہو رہا ہو۔ یہاں اجتماعی نظم کا معاملہ زیر بحث ہے۔ اگر انسان اجتماعی نظم کے معاملے میں بے پروا ہو جائے کہ اسے جو حکم ملا ہے اس کے مطابق کام کر لیا تب بھی ٹھیک ہے اور نہیں کیا تب بھی کوئی حرج نہیں' کہیں ساتھ گئے ہوئے ہیں اور کسی ڈیوٹی پر معین کیے گئے ہیں' اب جی میں آیا تو کھڑے رہے جی میں نہیں آیا تو وہاں سے چل دیے' تو ظاہر ہے کہ یہ طرزِ عمل اجتماعیت کی نفی ہے۔ اس قسم کے لوگ کتنی ہی کثیر تعداد میں جمع ہو جائیں وہ کبھی بھی جماعت نہیں کہلائیں گے' بلکہ وہ ایک ہجوم اور انبوہ ہو گا۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو اپنے ایک شعر میں واضح کیا ہے۔

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مؤمنیں!

ہجوم تو بہت بڑا جمع ہوسکتا ہے لیکن دنیا میں کوئی کام ہجوم (mob) سے نہیں ہوا۔ یہ صرف کوئی منفی کام ہی کرسکتا ہے‘ لیکن کوئی مثبت اور تعمیری کام کرنے کے لیے ایک منظم جماعت کی ضرورت ہوتی ہے‘ جن کے مراتب (cadres) معین ہوں کہ کون کس کا حکم سنے گا اور مانے گا‘ اس نظم میں کون کس سے بالاتر ہے‘ اس کی تعیین ہو اور اس میں سمع وطاعت کا نظام چل رہا ہو‘ جو کہ حضور ﷺ کے بعد لامحالہ سمع وطاعت فی المعروف ہے‘ لیکن اس میں سمع و طاعت کی روح برقرار ہو۔ یہ نہیں کہ جی میں آیا تو مان لیا جی میں نہیں آیا تو نہیں مانا۔ کسی اجتماع میں بلایا گیا ہے تو اگر طبیعت آمادہ ہوئی تو پہنچ گئے‘ اگر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی تو نہیں آئے۔ چھوٹے چھوٹے عذرات اور معمولی مشغولیتیں اور مصروفیتیں آڑے آئیں۔ معاشرے کی عام رسومات کو اس کام میں آڑے آنے دینے سے درحقیقت یہ اندازہ ہوتا ہے گویا اس کام کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تو فرمایا کہ مؤمن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور اُن میں سمع وطاعت کی یہ کیفیت پیدا ہو چکی ہے کہ جب بھی وہ رسول ؐ کے ساتھ کسی اجتماعی کام کے ضمن میں ہوتے ہیں تو جب تک اجازت حاصل نہ کرلیں وہاں سے نہیں جاتے۔

آگے اسی بات کو اس کے دوسرے رخ کے حوالے سے بیان کردیا کہ: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَاۡذِنُوۡنَکَ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ﴾ ’’(اے نبیؐ!) بے شک جو لوگ آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جو حقیقتاً اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں‘‘۔ یعنی جو لوگ آپ ؐ سے اجازت حاصل کرکے رخصت ہوتے ہیں‘ یا کسی کام پر طلب کیا گیا ہو تو اگر کسی وجہ سے نہیں آسکتے تو پہلے سے عذر پیش کرکے آپ ؐ سے اِذن حاصل کرلیتے ہیں‘ یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقتاً اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان میں احساس ہے کہ ہمیں اس کام میں شامل ہونا چاہیے تھا‘ حضور ﷺ جس مہم پر بھیج رہے ہیں



اس میں بہ دل وجان شریک ہونا چاہیے تھا۔ ہمارے ایمان کا تقاضا یہی تھا کہ جب ہم ایک اجتماعی کام کے سلسلے میں حضور ﷺ کے ساتھ ہیں تو وہاں سے نہ ہلیں جب تک کہ آپ ؐ سے اجازت طلب نہ کرلیں۔ ان کا یہ احساس بہت مبارک ہے‘ اور یہ درحقیقت ان کے ایمان کی علامت ہے‘ یہ احساس درحقیقت ان کے احساسِ فرض اور ان کے تصورِ نظمِ جماعت کا مظہر ہے۔ یہاں ایک طرح سے ان کی تعریف کی جارہی ہے۔

آگے ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَاِذَا اسۡتَاۡذَنُوۡکَ لِبَعۡضِ شَاۡنِہِمۡ فَاۡذَنۡ لِّمَنۡ شِئۡتَ مِنۡہُمۡ﴾ ’’پس جب وہ آپ ؐ سے اپنے کسی کام کی وجہ سے اجازت طلب کریں تو آپ ؐ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دے دیا کریں‘‘۔ یعنی جب وہ اپنے کسی معاملے کی وجہ سے آپ ؐ کے سامنے معذرت پیش کریں یا بیماری یا کسی اور اہم مصروفیت کی بنا پر آپ ؐ سے اجازت طلب کریں تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دے دیا کریں۔ نوٹ کیجیے ’فرمایا جارہا ہے کہ جسے آپ چاہیں اجازت دیں۔ یہ قابل غور بات ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اگر کسی نے معذرت کرلی ہے تو اب وہ یہ سمجھے کہ یہ آخری کام تھا جو میں نے کرلیا‘ اب مجھ سے اور کیا مطلوب ہے؟ میں نے نظمِ جماعت کا تقاضا تو پورا کرلیا‘ اب صاحبِ امر پر لازم ہے کہ وہ معذرت قبول کرے۔ یہ طرزِ عمل بھی اجتماعیت کی نفی ہے۔ اجتماعیت کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ آپ نے اپنا معاملہ صاحبِ امر کے حوالے کردیا ہے‘ اب یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ آپ کے عذر کو قابلِ قبول سمجھتا ہے یا نہیں۔ اس میں منطقی طور پر یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ ضروری نہیں ہوتا کہ کسی کام کی پوری اہمیت سب کو بتا دی جائے۔ وہ صاحبِ امر ہی جانتا ہے کہ اِس وقت کیا کام درپیش ہے‘ اس موقع کی کیا نزاکت واہمیت ہے اور اس کے نتائج کتنے دُوررس واقع ہوسکتے ہیں‘ یہ لمحہ اس جماعت‘ تحریک اور دعوت کے لیے کتنا فیصلہ کن ہوسکتا ہے۔ اب وہ ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کرے گا کہ اس کے مقابلے میں میرے ساتھی کے عذر کی کیا نوعیت واہمیت ہے‘ اس نظم کو اس سے کتنا نقصان واقع ہونے کا اندیشہ ہے‘ اور اس کی معذرت قبول نہ ہونے کی صورت میں اس کو کتنی تکلیف پہنچے گی۔ ظاہر ہے ہر معاملے میں توازن رکھنا پڑتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات لوگوں کے

سامنے بھی ہو، لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک کے سامنے ہو۔ بلکہ اس بارے میں حضورﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے: ((اِسْتَعِیْنُوْا عَلَی الْحَوَائِجِ بِالْکِتْمَانِ)) ''اپنے مقاصد کے حصول میں اخفاء سے مدد لو''۔ اپنے تمام کارڈز ٹیبل پر نہیں رکھ دیے جاتے، اپنے تمام منصوبوں کا اعلان نہیں کیا جاتا، بلکہ بسا اوقات ایک تحریک میں اور خصوصاً کسی انقلابی تحریک میں ایسے مراحل ناگزیر ہیں کہ آپ کرنا کچھ چاہتے ہوں اور آپ تأثر کچھ اور دیں۔ آپ نے جانا مشرق کو ہے لیکن کچھ ایسے احوال پیدا کر دیے جائیں کہ لوگ یہ سمجھیں کہ مغرب کو جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کو ایک ایک چیز علیحدہ کر کے بتا دی جائے۔ جس شخص پر امارت کی ذمہ داری ہے وہ اس کام کی اہمیت کو سمجھتا ہے، لہٰذا اگر آپ اس نظم سے منسلک ہیں تو آپ کی روش یہ ہونی چاہیے کہ آپ نے ایک عذر پیش کر دیا، اب ذہناً تسلیم کریں کہ صاحب امر کا اختیار ہے، اگر وہ میرے عذر کو قابلِ قبول سمجھتا ہے تو ٹھیک ہے، نہیں سمجھتا تو دنیا کی کوئی مجبوری و رکاوٹ اور کوئی مشغولیت اس کام سے بڑھ کر اہم نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ترجیحات کی تعیین نہ ہوئی تو کام آگے نہیں چلے گا اور قدم قدم پر رکاوٹ پیش آئے گی۔ چنانچہ اس راہ میں پہلی شرطِ لازم یہی ہے کہ آدمی طے کر لے کہ یہ کام مقدم ہے اور باقی سب کچھ مؤخر ہے ع شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی!

ہر تحریک میں ہر مرحلہ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ فیصلہ کن ہی ہو، لہٰذا اس موقع کے اعتبار سے اگر آپ نے کوئی عذر پیش کر دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن نظم کا تقاضا یہ ہوگا کہ یہ نہ سمجھئے کہ عذر کا پیش کر دینا ہی بس آخری تقاضا تھا جو پورا ہو گیا، بلکہ انسان کو ذہناً تیار ہونا چاہیے کہ اگر عذر قبول ہوگا تو ٹھیک ہے، ورنہ مجھے ہر دوسرے کام پر اس کام کو ترجیح دینی ہے۔

آگے فرمایا: ﴿ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۭ ﴾ ''اور (اے نبیؐ!) ان کے لیے اللہ سے استغفار بھی کیجیے''۔ اب یہاں نوٹ کیجیے کہ انہوں نے کون سا ایسا گناہ کیا ہے کہ استغفار کی ضرورت ہے۔ انہوں نے تو اجازت طلب کی ہے، وہ بغیر اِذن کے نہیں گئے ہیں اور ان کو اللہ پہلے سے سند دے چکا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کسی دنیاوی مصروفیت کو اتنا اہم سمجھا کہ دین کے کام



سے رخصت چاہی اور فی نفسہٖ یہ شے ایک کمزوری کی علامت ہے۔ ع ''نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی!'' کے مصداق میں یہ بات کبھی اس انداز سے بھی سمجھایا کرتا ہوں کہ فرض کیجیے اگر کوئی بیمار ہے تو کیا شفا آپ کے ہاتھ میں ہے؟ اور اس کی زندگی اور موت کا دار و مدار آپ کی موجودگی پر ہے؟ اگر کسی کا انتقال ہو گیا ہے تو کیا آپ کے وہاں جائے بغیر تدفین نہیں ہوگی؟ یا فرض کیجیے کہ کوئی زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے تو کیا آپ جا کر حضرت عزرائیل کو روک لیں گے؟ اسی بات کا دوسرا رخ دیکھئے! کیا اللہ ہر چیز پر قادر نہیں ہے؟ کیا وہ وہاں آپؐ کے بغیر اس ضرورت کو پورا نہیں فرما سکتا؟ حضورﷺ فرماتے ہیں: ((مَنْ کَانَ فِیْ حَاجَةِ اَخِیْهِ کَانَ اللّٰهُ فِیْ حَاجَتِهٖ)) (۱) ''اگر کوئی شخص اپنے کسی بھائی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس کے کسی کام میں لگا ہوا ہو تو اللہ اس کے کام کو پورا کرنے میں لگ جاتا ہے''۔ یہ تو انسانوں کا باہمی معاملہ ہے، آپ اپنے کسی بھائی یا رفیق یا کسی عزیز کے کام میں لگے ہوئے ہیں تو اللہ آپ کے کام میں لگ جاتا ہے، تو آپ سوچئے کہ اگر آپ اللہ کے کام میں لگے ہوئے ہوں تو کیا اللہ آپ کے کام میں نہیں لگے گا؟ بقول شاعر ؎

کارساز ما بہ فکر کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما!

یعنی میرا کارساز میرے کام کی فکر میں ہے اور اپنے کام کی خود فکر کرنا میرے لیے آزار کا موجب بن جاتا ہے۔ انسان کی فکر محدود ہے، علم محدود ہے اور عقل محدود ہے، تو جب وہ خود فکر کرے گا، خود تدبیر کرے گا تو لازماً ٹھوکر کھائے گا اور اپنے لیے مصیبت کھڑی کر لے گا۔ تو کیا ''تفویض الامر الی اللہ'' آسان ترین نسخہ نہیں ہے کہ ''اپنے کام کو اللہ کے حوالے کر دو''۔ اور کسی کام کا اللہ کے حوالے کر دینے کا انتہائی یقینی طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کے کام میں لگ جائیں۔ ویسے تو آپ خود تدبیر کرتے ہوئے بھی اللہ سے دعا مانگ سکتے ہیں لیکن اگر آپ اللہ کی نصرت کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ لازماً آپ کی نصرت کرے گا۔ اس لیے کہ کسی شریف

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغضب، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه۔ وصحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الظلم۔

اور بامروّت انسان سے بھی یہ بات بعید ہے کہ آپ اس کے دست و بازو بنیں اور وہ آپ کو تن تنہا چھوڑ دے' تو اللہ کے بارے میں کیسے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دے! اور دین کا کام ایک طرح سے اللہ کی نصرت ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾ (الصّف:۱۴) ''اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بن جاؤ جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم (علیہا السلام) نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کے معاملے میں؟'' ایک اور جگہ فرمایا: ﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ﴾ (الحدید:۲۵) ''اور اللہ جاننا چاہتا ہے (ظاہر کر دینا چاہتا ہے) کہ کون ہیں اس کے وفادار بندے جو اُس کی اور اُس کے رسول کی مدد کرتے ہیں غیب میں ہونے کے باوجود''۔ یعنی فی الاصل تو یہ ایک کمزوری ہے' البتہ جنہوں نے آپ ﷺ سے اجازت طلب کرنے کی پروا ہی نہیں کی' جنہیں نظم کا سرے سے احساس ہی نہیں ہے' ان سے تو یقیناً بہتر ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنا عذر پیش کیا' معذرت کی اور اجازت طلب کی۔ لیکن فی الاصل یہ ایک کمزوری کی بات ہے۔ دین کے اس کام میں تو ایسا ہونا چاہیے کہ ''ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم!'' کہ جو کچھ بھی ہو' ہم تو اب دریا میں اپنی کشتی ڈال چکے ہیں اور ہم نے اپنے تمام معاملات بہ تسلیم و رضا اللہ کے حوالے کر دیے ہیں۔

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را!

اس ضمن میں سورۃ التغابن کے درس میں جو چیزیں آتی ہیں' یعنی تفویض الامر اور تسلیم و رضا' ان تمام کیفیات کو یہاں اپنے ذہن میں لے آیئے۔ تو فرمایا: ﴿فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۲﴾﴾ ''تو آپ ان میں سے جس کو چاہیں اجازت دے دیں اور ان کے لیے اللہ سے معافی طلب کریں' یقیناً اللہ غفور ہے' رحیم ہے''۔ اور اسی کا ایک عکس' جیسا کہ سورۃ التغابن میں فرمایا' تمہیں اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔ اس حوالے سے امراء کے لیے کیا ہدایات ہیں یہ بات اگلے درس میں آئے گی' لیکن یہاں یہ



نوٹ کر لیجیے کہ حضور ﷺ کا طرزِ عمل یہی تھا کہ آپؐ سے جو بھی آ کر عذر پیش کرتا آپؐ جرح کیے بغیر اُس کا عذر قبول کر لیتے اور رخصت عطا کر دیتے تھے۔ اس لیے کہ خواہ مخواہ کسی کے لیے ایک ایسی آزمائش پیدا کر دینا یا اس کے لیے فوری طور پر کوئی بڑا امتحان لے آنا خلافِ مصلحت ہے۔ اس کی حقیقت آگے چل کر کھلے گی۔ پھر یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر محسوس بھی ہو کہ میرے کسی ساتھی نے اس وقت کمزوری کا مظاہرہ کیا ہے تب بھی اس کے لیے استغفار کریں اور خود بھی اسے معاف کریں' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بھی تو غفور ہے' رحیم ہے۔ سورۃ التغابن کی یہ آیت ذہن میں تازہ کیجیے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' پس ان سے ہوشیار رہو' اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو یقیناً اللہ غفور ہے' رحیم ہے''۔

یعنی اپنے اہل و عیال کی تربیت کے اعتبار سے جو روش اَنسب ہے وہی اختیار کرنی چاہیے اور وہی روش امراء کو اپنے مأمورین کے ساتھ اختیار کرنی چاہیے۔ اب یہاں بظاہر خطاب تو حضور ﷺ سے ہے لیکن اصل میں بالواسطہ طور پر خطاب کا رُخ لوگوں کی طرف ہے کہ تم اپنی جگہ پر یہ سمجھ لو کہ دین کے اس کام سے عذر پیش کرنا اور رخصت طلب کرنا فی الاصل ایک کمزوری ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یا تو اللہ پر توکل میں کمی ہے یا آپ ابھی مطمئن نہیں ہیں کہ اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان میں خامی اور کمی ہے۔ ؏ نغمہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی!

اب آگے چلیے۔ فرمایا: ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ﴾ ''مت ٹھہراؤ رسول کے بلانے کو اپنے مابین اس طرح جیسے تمہارا ایک دوسرے کو بلا لینا''۔ یہاں لفظ دعا (پکارنا' بلانا) محتمل المعنیین ہے اور اس کے دونوں مفہوم مراد لیے گئے ہیں۔ یہاں ''رسولؐ کو بلانا'' بھی مراد ہو سکتا ہے کہ آپ رسولؐ کو بلا رہے ہوں اور

''رسولؐ کا بلانا'' بھی ہوسکتا ہے کہ رسولؐ آپ کو بلا رہے ہوں۔ یہ پکارنا دوطرفہ مفہوم کا حامل ہے۔اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ رسول ﷺ سے گفتگو کرنے کو تم ایسا نہ سمجھ لو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہو۔ آپ ﷺ کا ادب واحترام اور اُن کی تعظیم ملحوظ نہیں رکھو گے تو اس اجتماعیت کو نقصان پہنچے گا جس کی شیرازہ بندی رسول کی مرکزی شخصیت کے گرد ہو رہی ہے۔ یہ مضمون سورۃ الحجرات میں پورے شرح وبسط کے ساتھ آ چکا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو' اور ان سے اس طرح بلند آہنگی سے بات نہ کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو' مبادا تمہارے سب اعمال غارت ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ حقیقت میں تو وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو رسول کے سامنے پست رکھتے ہیں وہی ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔ان کے لیے بخشش ہے اور بہت بڑا اجر ہے''۔

وہاں واقعات کے پس منظر میں ہدایات بھی آ گئیں۔فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

''یقیناً جو لوگ پکارتے ہیں آپؐ کو حجروں کے باہر سے اُن میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ ان کی طرف نکل آتے تو یہ اُن کے حق میں بہتر تھا' اور اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے''۔



تو یہ رُخ بھی یہاں مراد ہوسکتا ہے جو ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۃ الحجرات میں آ گیا ہے۔ یہاں ایک بات اور نوٹ کر لیجیے کہ اسی ادب واحترام کا ایک عکس اپنے امراء کے لیے ہونا چاہیے۔ بیعت ارشاد میں بھی یہی آداب تلقین کیے جاتے ہیں کہ جس مرشد کے ساتھ آپ نے اپنا ایک تعلق قائم کیا ہے' آپ اس سے ایک رہنمائی چاہ رہے ہیں' اس کی ہمت سے آپ اپنی ہمت کی تقویت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اگر اس کا ادب واحترام نہیں ہوگا تو آپ ہی کو کچھ حاصل نہیں ہوگا' ان کا کیا بگڑے گا! جیسے کہا جاتا ہے: باادب بانصیب' بے ادب بے نصیب۔ یہاں پر وہ معاملہ درجہ بدرجہ اس نظمِ جماعت میں بھی ہے کہ ہر شخص اپنے سے بالاتر کے ساتھ یہی انداز اختیار کرے۔اسی کی انتہائی شکل آپ کو ملٹری ڈسپلن میں ملتی ہے۔اپنے سے بالاتر کو سلیوٹ کرنا اسی حوالے سے ہے۔اگر یہ نہیں کر رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس نظم اور ڈسپلن کا مظاہرہ نہیں ہو رہا۔لہٰذا اپنے امراء کے ساتھ ادب و احترام کا معاملہ نہ صرف بالفعل موجود ہو بلکہ ظاہر بھی ہو رہا ہو' اس کی ایک فضا طاری ہو جائے۔ان آداب کے اعتبار سے یہ تو ایک پہلو ہو گیا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر آپ کو رسول ﷺ نے بلایا اور طلب کیا ہے تو اسے کسی دوسرے کے طلب کرنے کے برابر نہ ٹھہرالو۔کسی اور کی طلبی پر آپ حاضر ہوں یا نہ ہوں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔اسے تھوڑی سی شکایت ہو جائے گی' وہ کچھ گلہ وشکوہ کر لے گا لیکن رسولؐ کے بلانے کو اس پر قیاس نہ کر لینا۔اس کو بھی ذہن میں رکھئے کہ ایک تو بحیثیت رسول ان کا بلند ترین مقام ہے' لیکن اسی میں ہمارے لیے رہنمائی اور تعلیم مضمر ہے کہ اسلامی نظمِ جماعت میں امیر کا طلب کرنا اپنے کسی دوست' کسی بھائی یا کسی عزیز کا طلب کرنا نہیں ہے۔اس نظمِ جماعت کی طرف سے جب طلب کیا جائے تو نقشہ وہی ہونا چاہیے جو اِن اشعار میں بیان ہوا ہے۔

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا<br>
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی

خیریتِ جاں ، راحتِ تن ، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی!

یہ دو اشعار بہت عمدہ ہیں اور یہ تحریکی مزاج کے عکاس ہیں کہ کسی انقلابی جماعت میں شریک لوگوں کا کیا انداز ہونا چاہیے۔ یہ کہ جیسے ہی گھنٹی بجی اور اس جرس کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی، تو آواز تنہا واپس نہیں گئی، ہم اس کے ساتھ ہی گئے۔ اس راستے میں جو چیزیں رکاوٹ بن سکتی ہیں، خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں، ان میں سے کوئی چیز بھی راستے میں رکاوٹ نہیں بنی۔

بہرحال جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، عذر پیش کرنا فی الاصل کمزوری کا اظہار ہے۔ کیوں نہیں اللہ پر توکل کرتے ہوئے اپنے معاملے کو اللہ کے حوالے کرتے؟ کیوں نہیں اپنے معاملات سے بےفکر ہو کر اس کام میں لگ جاتے؟

آگے فرمایا: ﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ﴾ ''اللہ اُن کو خوب جانتا ہے جو تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے کھسک جاتے ہیں''۔ ''قَدْ'' کے آنے سے بات میں ایک قطعیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ عام طور پر فعل ماضی پر آتا ہے اور اس کو ''فعل حال مکمل'' (Present Perfect Tense) میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہاں یہ مضارع پر آ رہا ہے اور اس سے مراد ہے کہ یہ معاملہ ایک ہی واقعہ سے متعلق نہ سمجھنا، بلکہ اللہ کا یہ معاملہ دائمی ہے، جاری و ساری ہے اور اس میں قطعیت اور حتمیت ہے۔ یہاں لفظ ''يَتَسَلَّلُوْنَ'' استعمال ہوا ہے۔ سَلَّ۔ يَسُلُّ کا مطلب ہے نیام سے تلوار کھینچ لینا، تلوار سونت لینا۔ باب تفعل میں تَسَلَّلَ۔ يَتَسَلَّلُ کا مطلب ہو گا کھنچ جانا، خود نکل جانا۔ بہترین ترجمہ ہو گا کھسک جانا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہیں تم میں سے وہ لوگ جو کھسک جاتے ہیں ایک دوسرے کی اوٹ لے کر۔ حضور ﷺ نے طلب کیا ہے تو جمع تو ہو گئے۔ لیکن اب ڈر رہے ہیں کہ معلوم نہیں مسئلہ کیا ہے۔ شاید کوئی عام بات ہو، یا ویسے ہی مشورہ ہو، یا کوئی سماجی قسم کا معاملہ ہو، اس مغالطے میں پہنچ تو گئے۔ آگے جا کر معلوم ہوا کہ کوئی جیش بھیجنا ہے، لشکر کی روانگی کا فیصلہ ہے۔ حضور ﷺ نے مطالبہ رکھا ہے کہ ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا﴾



''نکلو اللہ کی راہ میں خواہ ہلکے ہو یا بوجھل''۔ لہٰذا اب جان پر بنی ہوئی ہے کہ کسی طریقے سے نظر بچا کر کھسک جائیں۔ ان الفاظ میں ایک پوری ذہنیت کا نقشہ موجود ہے کہ جو جان کترا کر نکل جاتے ہیں۔ حالانکہ اہل ایمان کا معاملہ تو اس کے برعکس یہ ہوتا ہے ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں!

ایک اور مقام پر اس ذہنیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ (الحج)

''اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو اللہ کی عبادت کرتا ہے کنارے کنارے، پس اگر اسے کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو اس سے مطمئن ہو جاتا ہے، اور اگر اسے کوئی آزمائش پہنچتی ہے (کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے) تو اپنے چہرے کے بل واپس پلٹتا ہے۔ اس نے دنیا بھی گنوائی اور آخرت بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ''۔

چنانچہ آگے فرمایا: ﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ ''تو ڈرنا چاہیے ان لوگوں کو جو رسولؐ کے معاملے کی مخالفت کر رہے ہیں مبادا اُن پر کوئی بہت بڑا فتنہ مسلط ہو جائے یا اللہ کی طرف سے اُن پر کوئی دردناک عذاب مسلط کر دیا جائے''۔

﴿اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾ ''خبردار رہو! آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے''۔ لِلّٰهِ کے شروع میں جو لام ہے یہ لامِ تملیک بھی ہے اور ''لامِ استحقاق'' بھی۔ یہ قدرت کے لیے بھی ہے، یعنی جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے، اللہ ہی کے دستِ قدرت میں ہے، کوئی چیز اُس کی قدرت سے باہر نہیں، کوئی چیز اُس کے اختیار سے آزاد نہیں۔ تمام عناصرِ فطرت اُس کے حیطۂ قدرت میں ہیں۔ تمام سلسلۂ

اسباب وعلل اُس مسبّب الاسباب کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ لہٰذا یہ نہ سمجھو کہ تم چلے جاؤ گے تو یہ ہو جائے گا اور تم گھر میں نہیں رہو گے تو یہ ہو جائے گا۔ ہوگا وہی جو اِذنِ ربّ ہوگا۔ اور اگر تم اس کے ساتھ اپنے معاملے کو درست رکھو تو وہ تمہارے معاملے کو درست کرے گا۔ ﴿قَدْ يَعْلَمُ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ﴾ ”تم جس روش پر ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے“۔ بامحاورہ ترجمہ ہوگا کہ تم جتنے پانی میں ہو اُس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ جس روش پر تم ہو وہ اس کے علم میں ہے۔ ایمان کتنا کچھ ہے‘ اس میں نفاق کس حد تک سرایت کر گیا ہے‘ اس میں کس حد تک واقعتاً آخرت کی ترجیح ہے اور کس حد تک دنیا طلبی شامل ہو گئی ہے‘ اللہ خوب جانتا ہے۔ ﴿وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ﴾ ”اور جس دن وہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ ان کو (اپنے علمِ کامل کی بنا پر) جتلا دے گا (بتا دے گا) جو کچھ کہ انہوں نے عمل کیا تھا“۔ ﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾﴾ ”اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے“۔

اب آیئے دوسرے مقام کی طرف۔ یہ سورۃ التوبۃ کی آیات ۴۳ تا ۴۹ پر مشتمل ہے۔ یہاں پس منظر میں غزوۂ تبوک اور اس کے لیے نفیر عام ہے‘ لہٰذا یہاں جو ایک بہت بڑا بنیادی فرق ہے اگر پہلے اس کو سمجھ لیا جائے تو دونوں مقامات کے مابین جو ظاہری تضاد نظر آتا ہے اس کو رفع کرنے میں مدد ملے گی۔ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے دوران جتنی بھی جنگیں اور غزوات ہوئے اور آپؐ نے جتنے بھی سرایہ بھیجے‘ کبھی بھی آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس میں ہر مسلمان کا شریک ہونا لازمی ہے‘ بلکہ سارا دارومدار ترغیب وتشویق پر ہوتا تھا کہ لوگو! نکلو اللہ کی راہ میں اور جنت حاصل کرو۔ ﴿سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ کے مصداق ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ لیکن غزوۂ تبوک کے موقع پر نفیر عام ہوئی اور سب کے لیے نکلنا لازم قرار دیا گیا‘ اِلاّ یہ کہ کوئی شخص عذر پیش کر کے اجازت حاصل کرے۔ تو اس طرح کا لزوم صرف غزوۂ تبوک کے موقع پر ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ وہاں منافقین کثیر تعداد میں موجود تھے۔ یہ ۹ ھ تھا اور اُس وقت تک یہ شجرۂ خبیثہ پورے طور پر برگ وبار لا چکا تھا۔ اب وہ آرہے ہیں اور جھوٹ بول کر اور جھوٹی قسمیں کھا کر اللہ کے رسول ﷺ سے اجازت طلب کر رہے



ہیں۔ اور آپ ﷺ کی مروّت کا یہ عالَم تھا کہ آپؐ نے کبھی کسی جھوٹے کو اس کے مُنہ پر جھوٹا نہیں کہا۔ یہ نہ سمجھئے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے حالات سے بے خبر تھے۔ یہ تو ہر صاحب بصیرت شخص اندازہ کر لیتا ہے کہ فلاں شخص اِس وقت جھوٹ بول رہا ہے اور اس شخص کی اصل کیفیت کیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے تو عام اہل ایمان کے بارے میں فرمایا: ((اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ)) (۱) ”مؤمن کی فراست سے ڈرو‘ اس لیے کہ وہ تو اللہ کے نور سے دیکھتا ہے“۔ تو آپ غور کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کی فراست کا عالم کیا ہوگا! لیکن رسول اللہ ﷺ اچھی طرح جاننے کے باوجود اُن کے عذر تسلیم کر لیتے تھے اور انہیں رخصت دے دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی نکلتا تھا کہ وہ جری ہو کر استہزاء کے انداز میں کہا کرتے تھے کہ ”هُوَ اُذُنٌ“ کہ یہ تو صرف کان ہی کان ہیں۔ گویا اِن کے دماغ میں (معاذ اللہ) بھیجا نہیں ہے‘ ہم جھوٹ بولتے ہیں اور یہ مان لیتے ہیں‘ ہم جا کر بالکل بغیر کسی حقیقت کے کوئی بناوٹی عذر پیش کرتے ہیں اور وہ تسلیم کر لیتے ہیں‘ جو چاہو اِن کے کان میں اُتار دو یہ اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہونا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کی یہ عادت کس قدر راسخ تھی کہ جس نے عذر پیش کیا آپؐ نے قبول کر لیا۔ اس میں یقیناً مصلحت یقیناً تھی‘ جو آگے بیان ہو جائے گی۔ جو بھی چیز اخلاقِ عالیہ وفاضلہ کے مطابق ہوگی اس میں مصلحت یقیناً ہوگی‘ لیکن اگر کسی وقت بالفعل کوئی مصلحت نظر نہ آئے تو بھی کوئی حرج نہیں‘ آدمی اس پر اپنے اخلاق کے تقاضے کے اعتبار سے عمل کرتا ہے۔

یہاں ذرا گرفت کا انداز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو کچھ ٹوکا گیا ہے کہ ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ﴾ یہ ”انشائیہ“ کلمہ بھی ہوسکتا ہے اور خبریہ بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے ”رضی اللہ عنہم“ خبریہ کلمہ بھی ہوسکتا ہے کہ ”اللہ اُن سے راضی ہو گیا“ اور دعائیہ کلمہ بھی ہوسکتا ہے کہ ”اللہ اُن سے راضی ہو جائے“۔ تو یہاں بھی دو ترجمے ہوں گے۔ ایک یہ کہ ”اللہ نے آپؐ کو معاف فرما دیا“۔ یہ کلام خبریہ ہے۔ اور دوسرا یہ کہ ”اللہ آپؐ کو معاف فرمائے“۔ یہ کلامِ انشائیہ ہے۔ لیکن کس بات پر؟ فرمایا: ﴿لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾﴾ ”آپؐ نے ان کو اجازت کیوں دی (آپ نے ان کا عذر کیوں قبول کیا)؟

یہاں تک کہ آپ پر واضح ہو جاتا کہ کون ہیں جو (اپنے ان عذرات میں) سچے ہیں اور آپ جان لیتے کہ کون ہیں جو جھوٹے ہیں''۔

نوٹ کیجیے کہ یہاں بھی وہی الفاظ آئے ہیں جیسے سورۃ العنکبوت کے آغاز میں آئے ہیں۔ وہاں فرمایا: ﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳﴾ ان الفاظ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ''پس اللہ لازماً جان کر رہے گا ان لوگوں کو جو سچے ہیں اور لازماً جان کر رہے گا ان کو بھی جو جھوٹے ہیں''۔ لیکن چونکہ اللہ تو جانتا ہے' اس کا علم تو کامل ہے' لہٰذا ہم ترجمہ اس طرح کرتے ہیں: ''پس اللہ لازماً ظاہر کر دے گا کہ کون سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں''۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر پھر یہ بات آئی کہ: ﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝۱۱﴾ ''اور اللہ لازماً کھول کر رکھ دے گا کہ کون مؤمن صادق ہیں اور لازماً کھول کر رکھ دے گا کہ کون منافق ہیں''۔ تو یہاں پر بھی وہی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی آزمائش ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کون کیا ہے اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔ جب آپ نے عذر قبول کر لیا تو آزمائش ختم ہو گئی اور ان کے نفاق پر پردہ پڑا رہ گیا۔ اگر آپ تحقیق کرتے اور پھر آپ کہتے کہ نہیں یہ عذر تو اس قابل نہیں ہے کہ اسے قبول کیا جائے' ذرا دیکھیے تو سلطنتِ روما سے ٹکراؤ شروع ہو چکا ہے' کتنا نازک وقت ہے جو اسلام اور عالمِ اسلام پر آ گیا ہے اور آپ لوگ اپنے ان عذرات کو پیش کر رہے ہیں' آپ کا عذر قبول نہیں ہے۔ اگر آپ ؐ یہ کہہ دیتے تو اب ان کے لیے امتحان ہو جاتا۔ جانا تو انہوں نے پھر بھی نہیں تھا' لیکن واضح تو ہو جاتا کہ ان کے اندر سرکشی ہے' تمرّد ہے' معصیت اور نافرمانی ہے۔ جب آپ ؐ نے اجازت دے دی' معذرت قبول کر لی تو اُن کے نفاق کا پردہ چاک نہیں ہوا۔

آگے فرمایا: ﴿لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ﴾ ''یقیناً جو لوگ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ آپ ؐ سے یہ رخصت نہیں چاہ سکتے (معذرت نہیں کر سکتے) کہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں اپنے جان اور مال سے''۔ وہ کبھی عذر پیش کر کے یہ درخواست نہیں کریں گے کہ انہیں دل و جان



کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔ یہ تو ایمان کا لازمی تقاضا ہے' لہٰذا اہل ایمان اس سے کیسے رخصت طلب کریں گے؟

یہ ہے وہ ظاہری تضاد جو اِن دو مقامات پر نظر آتا ہے۔ وہاں (سورۃ النور میں) الفاظ ہیں: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ﴾ ''(اے نبی!) یقیناً جو لوگ آپ ؐ سے اِذن طلب کرتے ہیں وہی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ اور اس کے رسول پر''۔ جبکہ یہاں فرمایا کہ ''جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو اِذن طلب نہیں کرتے''۔ یہ بظاہر ایک دوسرے کے برعکس باتیں ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی تضاد نہیں۔ ایک تو اس کی تاویل خاص ہے کہ سورۃ التوبۃ کی آیات غزوۂ تبوک کے پس منظر میں نازل ہوئی ہیں' لیکن اس سے قطع نظر عام حالات میں بھی اس کی تطبیق یوں کی جا سکتی ہے کہ اگر تین سیڑھیاں ہوں جیسے منبر کی ہوتی ہیں' تو ظاہر ہے کہ پہلی سیڑھی سے دوسری بلندتر ہے' لیکن تیسری کے مقابلے میں یہ پست تر ہے۔ چنانچہ بلندی اور پستی اضافی (relative) چیزیں ہیں۔ یہ بات اگر سامنے رکھی جائے کہ کون سی شے کس کے حوالے سے پست ہے اور کس کے حوالے سے بلند ہے تو پھر اس کے تین درجے ہوں گے۔ اصل درجہ جو مطلوب ہے وہ یہ کہ رخصت طلب ہی نہ کی جائے' اس لیے کہ اگر آپ کو اللہ کی قدرت پر اور اس کے مسبّبُ الاسباب ہونے پر یقین ہے' آپ مانتے ہیں کہ اللہ آپ کی ضروریات کو آپ سے بہتر جانتا ہے اور وہ آپ کے مسئلے کو خود آپ کے انداز سے کہیں بہتر طور سے حل کر سکتا ہے تو پھر عذر کی گنجائش کہاں سے نکلے گی؟ تو جو کوئی بھی واقعتاً ان باتوں پر ایمان رکھتا ہے وہ تو عذر پیش نہیں کرے گا' رخصت نہیں چاہے گا۔ لیکن اس سے نیچے آئیے تو معلوم ہو گا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو چپکے سے گھر بیٹھے رہتے ہیں اور اجتماعی معاملات میں شریک ہی نہیں ہوتے' یا وہاں سے خاموشی سے کھسک جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ عذر پیش کرتے ہیں اور نہ رخصت طلب کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے مقابلے میں عذر پیش کرنے والے صاحبِ ایمان قرار پائے کہ اِن کے مقابلے میں اُن کے ایمان کی نفی ہو جائے گی جو عذر بھی پیش نہیں کرتے۔ لیکن جو معیارِ مطلوب اور مقامِ مقصود ہے اس کے اعتبار سے

معذرت اور رخصت طلب کرنا گویا ایمان کی نفی کے مترادف ہے۔ چنانچہ یہ درحقیقت relative معاملہ ہے۔

اس میں دوسرا پہلو تائو ویلِ خاص کا ہے کہ جب نفیرِ عام نہ ہو تو عذر کا طلب کیا جانا کچھ اور معنی رکھتا ہے' اور جب اس شدت کے ساتھ حکم دیا گیا ہو کہ اب ہر ایک کو نکلنا ہے تو اس سے موقع کی جو نزاکت سامنے آتی ہے اس کے اعتبار سے عذر طلب کرنا کوئی اور معنی رکھے گا۔ تو ان دونوں پہلوؤں سے ان کے مابین تطبیق کو جان لینا چاہیے۔ آگے ارشاد ہے:
﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴾ ''اور اللہ جانتا ہے ان کو کہ جن کے دلوں میں تقویٰ ہے''۔ جن میں ایمان ہے' خشیت ہے' انابت ہے۔ وہ اللہ کی رضا جوئی میں سرگرداں اور سرگرم ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''یقیناً (اے نبیؐ!) جو لوگ آپ سے (اس موقع پر بھی) اجازت طلب کرتے ہیں یہ تو وہی ہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے''۔ ﴿وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴾ ''اور ان کے دل (ریب اور) شک کے اندر مبتلا ہو چکے ہیں (ان کے دلوں میں شکوک وشبہات نے ڈیرے جما لیے ہیں) تو وہ اپنے اس شک کی وجہ سے متردد ہو کر رہ گئے ہیں''۔ رَدَّ - يَرُدُّ کا مطلب ہے ''لوٹا دینا'' اور بابِ تفعل میں اس کا مطلب ہوتا ہے ''خود لوٹنا''۔ جبکہ مُتَرَدِّدٌ ہوگا ''خود لوٹنے والا''۔ تو گویا یہ متردد ہو کر رہ گئے ہیں کہ آگے بڑھیں نہ بڑھیں! چلیں نہ چلیں! اسی کو تَرَبُّص کہا گیا ہے۔

آگے ارشاد ہے: ﴿وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً﴾ ''اور اگر ان کا واقعی (اللہ کی راہ میں) نکلنے کا ارادہ ہوتا تو انہوں نے اس کے لیے تیاری کی ہوتی (اہتمام کیا ہوتا' سامان جمع کیا ہوتا)''۔ ان کا طرزِ عمل بتا رہا ہے کہ ان کی نیت خراب تھی' عین وقت پر آ کر کہہ دیا کہ میری یہ مجبوری ہے' جبکہ اس کے لیے اہتمام سرے سے کیا ہی نہیں۔ انہوں نے اپنے مسائل کے حل کے لیے کوئی بھاگ دوڑ نہیں کی۔ ان کا اصل ارادہ تو اس سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اگر ان کا واقعی نکلنے کا ارادہ ہوتا تو کچھ تیاری تو کرتے۔ ﴿وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ﴾ ''اور لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا پسند ہی نہیں تھا''۔ اب یہاں سے تصویر کا دوسرا رُخ



شروع ہو رہا ہے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ اگر کسی کو توفیق نہیں ملی تو یہ بھی کوئی اندھی' بہری کائنات نہیں ہے' اس میں ایک ایسی ہستی کا ارادہ کارفرما ہے جو سمیع اور بصیر ہے' حیّ اور قیوم ہے' علیم اور خبیر ہے۔ اگر کسی کو توفیق نہیں ملی تو یہ بھی اللہ کا فیصلہ ہے کہ ان کو توفیق نہ ملے۔ یہ اللہ ہی نے نہیں چاہا کہ وہ نکلیں' اللہ ہی نے ان کا نکلنا پسند نہیں کیا۔ ﴿فَثَبَّطَهُمْ﴾ ''پس انہیں جما دیا''۔ زمین میں ان کو گاڑ دیا۔ ان کے پاؤں منوں کے ہو گئے' وہ نکل نہیں پائے۔ ﴿وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴾ ''اور (انہیں) کہا گیا کہ بیٹھ رہو بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ''۔ اصل میں توفیق اللہ کی طرف سے ملتی ہے اور اس کا بھی اس نے قاعدہ بنایا ہے کہ جس کا ارادہ ہو گا اسی کو توفیق ملے گی' جس کا ارادہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ اسے زبردستی توفیق دے تو کائنات کا سارا نظم ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ تو امتحان گاہ ہے۔ جیسے کہا گیا ہے: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک:۲) ''اس نے موت اور حیات کو تخلیق کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے عمل کے اعتبار سے اچھا''۔ وہ لشکر کے ساتھ کسی کو زبردستی نکال دیا کرے تو نکلنے والوں کا کوئی کریڈٹ نہیں رہے گا اور نہ نکلنے والے قصوروار قرار نہیں پائیں گے۔ اس اعتبار سے یہ اللہ تعالیٰ کی سنتِ سابقہ اور حکمتِ تخلیق کے مطابق ہے کہ جن کا ارادہ نہیں ہوتا انہیں اللہ بھی دفع کرتا ہے۔ جیسے سورۃ التوبۃ میں کہا گیا ہے: ﴿فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ (آیت ۲۴) ''تو جاؤ (دفع ہو جاؤ) انتظار کرو' یہاں تک کہ اللہ اپنا آخری فیصلہ سنا دے''۔ لہٰذا اللہ ہی نے نہیں چاہا کہ وہ نکلیں اس کی راہ میں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے کیوں نہیں چاہا؟ یہ تصویر کا دوسرا رُخ ہے۔ فرمایا: ﴿لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا﴾ ''اگر یہ تمہارے ساتھ نکلتے (اس مہم میں تمہارے مابین ہوتے) تو نہ اضافہ کرتے تمہارے لیے مگر برائی کا''۔ یہ حقیقت ہے کہ شکوہ سنج اور ناراض افراد (disgruntled element) سے کوئی خیر وجود میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ بے دلی سے کام کرنے والا کام بنائے گا کم اور بگاڑے گا زیادہ۔ وہ بدگمانیاں پیدا کرے گا' طرح طرح کے شوشے چھوڑے گا اور لوگوں میں انتشار پیدا کرے

گا۔ تو ایسے لوگوں کا اس جمعیت میں ہونا تو درحقیقت ایک بالقوہ کمزوری (potential weakness) ہے۔ تعداد زیادہ ہونا ہر حال میں مفید نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا کہ اس قسم کے تھڑدلے، خام ارادے رکھنے والے اور دنیا پرست لوگ تمہاری صفوں میں ہوں۔ ﴿وَلَاۡاَوۡضَعُوۡا خِلٰلَكُمۡ يَبۡغُوۡنَكُمُ الۡفِتۡنَةَ ۚ﴾ ''اور تمہارے مابین فتنہ پردازی کے لیے دوڑ دھوپ کرتے''۔ ان کی ساری بھاگ دوڑ اسی میں ہوتی کہ وہ تمہارے لیے فتنوں کی تلاش میں کہیں سے کوئی بات اُچک کر دوسری جگہ جا کر اسے ہوا دیں اور بے اطمینانی پیدا کریں۔ کہیں اَوس اور خزرج کے مابین پرانی عصبیتوں اور حمیتوں کی چنگاری بھڑکا کر انہیں آپس میں ٹکرانے کی کوشش کریں۔ اس طرح تو بہت اچھا ہوا کہ تمہاری جمعیت جو نکلی وہ خالص جمعیت تھی اور وہ ان عناصر سے پاک رہی۔

آگے فرمایا: ﴿وَفِيۡكُمۡ سَمّٰعُوۡنَ لَهُمۡ ؕ﴾ اس کے بھی دونوں ترجمے مراد ہیں اور دونوں ہی نہایت حکیمانہ ترجمے ہیں۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا: ''تم میں ہیں وہ لوگ جو بہت سننے والے ہیں ان کے لیے''۔ اس کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اے مسلمانو! تمہاری صفوں میں وہ لوگ موجود ہیں جو اُن کی باتیں بڑے دھیان سے، کان لگا کر اور دلی آمادگی سے سنتے ہیں۔ پرنالہ وہیں گرتا ہے جہاں نشیب ہو۔ تو وہ نشیب ان کے اندر موجود ہے لہٰذا پوری توجہ سے ان کی باتیں سنتے ہیں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے مابین ایسے لوگ موجود ہیں جو اُن کے لیے سنتے ہیں، یعنی تمہاری خبریں وہاں پہنچانے کے لیے تمہارے درمیان موجود ہیں۔ یہ مسلمانوں کی اجتماعیت میں جاسوسی کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں، درحقیقت ان کی حیثیت آلاتِ ترسیل (transmitters) کی ہے۔ یہ لوگ تمہاری باتیں خوب کان لگا کر سنتے ہیں کہ کوئی خبر رہ نہ جائے، کیونکہ انہوں نے فتنے کی آگ بھڑکانے کے لیے یہ باتیں ان تک پہنچانی ہوتی ہیں۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے''۔ اللہ کی نگاہوں سے وہ چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿لَقَدِ ابۡتَغَوُا الۡفِتۡنَةَ مِنۡ قَبۡلُ وَقَلَّبُوۡا لَكَ الۡاُمُوۡرَ حَتّٰى جَآءَ الۡحَقُّ



وَظَهَرَ اَمۡرُ اللّٰهِ وَهُمۡ كٰرِهُوۡنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمہیں ناکام بنانے کے لیے ہر طرح کی تدبیروں کا الٹ پھیر کر چکے ہیں، یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا جبکہ وہ اسے ناپسند کرتے رہے''۔

اب یہ وہ تاریخی پس منظر ہے کہ اے نبیؐ! یہ آپ کے لیے پہلے سے بہت سے فتنے اٹھا چکے ہیں، بہت سے مواقع پر انہوں نے فتنوں کی آگ بھڑکائی ہے اور آپؐ کے لیے معاملات کو تلپٹ کرنے میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ قَلَّبَ، يُقَلِّبُ، تَقۡلِيۡبًا کا مطلب ہے بدل دینا، کسی شے کو الٹ دینا۔ جیسے ارشاد ہوا: ﴿وَنُقَلِّبُ اَفۡـئِدَتَهُمۡ وَاَبۡصَارَهُمۡ كَمَا لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (الانعام:۱۱۱) ''اور ہم پلٹ دیں گے ان کے دلوں اور نگاہوں کو اسی طرح جس طرح یہ پہلی مرتبہ (حق کا انکشاف ہونے کے باوجود) اس (کتاب) پر ایمان نہیں لائے تھے''۔ تو یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ آپ کے لیے معاملات کو تلپٹ کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آ گیا اور اللہ کا امر ظاہر ہو گیا۔ یہ جو حق آیا ہے یہ انہیں پسند نہیں ہے۔ ان کو تو بڑی ناگواری ہے۔ لیکن ان کی ناپسند اور ناگواری کے علی الرغم اللہ کا فیصلہ آ گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اُس وقت تک جزیرہ نمائے عرب میں تو رسول اللہ ﷺ کو غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ غزوۂ تبوک ۹ھ کا معاملہ ہے جبکہ ۸ھ میں مکہ فتح ہو چکا تھا، ۸ھ ہی کے شوال میں غزوۂ حنین بھی ہو چکا تھا اور یوں سمجھئے کہ سرزمین عرب میں آخری معرکہ وہی تھا، تو عرب پر تو غلبہ ہو چکا تھا اور لوگ جوق در جوق اور فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو گئے تھے۔ لہٰذا یہ سب کچھ جو ہوا ہے یہ بھی ان کی ناپسندیدگی کے علی الرغم ہوا ہے۔ اب بیرونِ ملک عرب، بین الاقوامی سطح پر انقلابِ محمدیؐ اور غلبۂ دینِ حق کا جو مرحلہ شروع ہو رہا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ بھی انہیں پسند نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اگر آپؐ کے ساتھ جاتے تو کوئی نہ کوئی خرابی پیدا کرتے، وہاں بھی کوئی نہ کوئی فتنہ برپا کرتے۔ تو ایک اعتبار سے یہ بہتر ہی ہوا کہ یہ نہیں گئے۔

اب دیکھئے' ایک ہی بات کے کتنے رُخ ہیں۔ ﴿لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾ ''آپؐ نے انہیں کیوں اجازت دی؟'' یہ علیحدہ بات ہے۔ آپ کو اجازت نہیں دینی چاہیے تھی' تاکہ ان کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی اور ان کی پردہ دری ہوتی کہ یہ کیا ہیں اور کتنے پانی میں ہیں' لیکن نتیجہ کے اعتبار سے یہی بہتر ہے کہ وہ نہیں آئے۔ اس بات کو ہم اپنے معاملات پر منطبق کریں تو یہ رہنمائی ملتی ہے کہ امیر جماعت کو ذہناً اس طرزِ عمل پر مطمئن رہنا چاہیے کہ وہ اجتماعی معاملات میں ساتھیوں کو ساتھ لے کر چلنے کی پوری کوشش کرے' لیکن اگر کوئی پیچھے رہتا ہے تو اس کے لیے زیادہ متفکر نہ ہو' اس کے بارے میں زیادہ تشویش میں مبتلا نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے پیچھے رہ جانے ہی میں بھلائی ہو۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ تبوک میں بیس دن قیام پذیر رہے لیکن لڑائی نہیں ہوئی تو یہ ایک طرح سے اہل ایمان کی بہت اعلیٰ درجے کی پکنک تھی کہ حضور ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں اور گفتگو ہو رہی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مدینہ میں رہتے ہوئے حضور ﷺ کے ساتھ گفتگو کے مواقع تو سب کو حاصل نہ ہو سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ بیرونِ مدینہ سے بھی لوگ اس لشکر میں موجود تھے۔ ۳۰ ہزار کے لشکر میں جانے کہاں کہاں سے لوگ آئے ہوں گے! اور یہاں صبح وشام سب اہل ایمان آپؐ کی صحبت سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ تو وہاں پر ذکر ہوجاتا تھا کہ فلاں صاحب کیوں نہیں آئے؟ تو نبی اکرم ﷺ اس تذکرے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپؐ کا قولِ مبارک ہوتا تھا کہ ((دَعْهُ)) کہ چھوڑو اس کے ذکر کو۔ اگر اس میں کوئی خیر ہے تو اللہ اسے تمہارے ساتھ ملا دے گا اور اگر اس میں شر ہے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کے شر سے نجات دی' اسی میں بہتری ہے۔ تو دراصل یہ انداز ہونا چاہیے۔ یہ بھی طے نہ کیجیے کہ لازماً شر ہے۔ اس لیے کہ آپ کے پاس تو علم کامل نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عین وقت پر کوئی مجبوری پیش آگئی ہو' زیادہ سے زیادہ خیر اور حسنِ ظن کو اپنے ذہن میں لانے کی کوشش کریں' لیکن تشویش کو روکنے کے لیے اصولاً اس بات کو جان لیں کہ ہر شخص کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ ہر شخص اپنا بنا رہا ہے یا بگاڑ رہا ہے' اپنے لیے کمائی کر رہا ہے یا اپنے لیے وبال جمع کر رہا ہے' لہٰذا اس معاملے میں ہم کیوں خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا ہوں۔ اگر خیر ہے تو وہ ظاہر ہوجائے



گی۔ کوئی کوتاہی رہ گئی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے تلافی کا معاملہ پیدا کر دے گا اور اگر شر ہے تو شر کا تو دور رہنا ہی بہتر ہے۔

آگے ارشاد ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ﴾ ''اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے رخصت دیجیے اور مجھے فتنے میں نہ ڈالیے!'' اس قول کی ایک خاص تاویل بھی ہے اور عام تاویل بھی۔ دونوں کو سمجھ لینا چاہیے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے تو اجازت دے ہی دیجیے' مجھے آزمائش میں مت ڈالیے! یعنی اجازت نہیں دیں گے تو جانا تو میں نے پھر بھی نہیں' لیکن خواہ مخواہ میرے نفاق کا پردہ چاک ہو جائے گا! کیونکہ دل میں یہ فیصلہ پہلے سے موجود ہے۔ اگر آپ اجازت دے دیں گے تو میرا پردہ پڑا رہ جائے گا۔ مجھے خواہ مخواہ اس امتحان میں نہ ڈالیے۔ مجھے اس ابتلاء اور فتنے میں مبتلا ہونے سے بچا لیجیے۔ فرمایا: ﴿اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ﴾ ''آگاہ ہو جاؤ کہ فتنہ میں تو وہ پڑ چکے''۔ یہ بڑا پیارا انداز ہے۔ جب انہوں نے اللہ کی پکار پر' اللہ کے رسولؐ کے فرمان پر' اس جماعت کے کسی نظم کے تقاضے پر جو اقامتِ دین کے لیے قائم ہوئی تھی' اپنی کسی ضرورت' مصروفیت یا کسی مصلحت کو مقدم رکھا تو فتنے میں تو وہ پڑ چکے' اور امتحان کس شے کا نام ہے؟ اور ناکامی کس بلا کا نام ہے؟ ناکام تو وہ ہو چکے! سَقَطَ ۔ يَسْقُطُ کسی شے کے وقوع کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کا ایک مفہوم گر پڑنے کا بھی ہے۔ یعنی یہ تو گر چکے' ناکام ہو چکے' اب اور کس آزمائش سے بچنے کی فکر ہے؟ ﴿وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٩﴾﴾ ''اور یقیناً جہنم ان کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے''۔ اس سے بچ کر کہاں جائیں گے؟

اس قول کے بارے میں ایک خاص واقعہ بھی آتا ہے کہ جد ابن قیس (ایک منافق) نے آکر بڑے گستاخانہ اور استہزائیہ انداز میں کہا کہ حضورؐ! مجھے تو آپ اس آزمائش میں نہ ڈالیے۔ میں ذرا حسن پرست انسان ہوں اور جس علاقے میں آپؐ یہ لشکر لے کر جا رہے ہیں وہاں کی رومی عورتیں بڑی حسین ہوتی ہیں' معلوم نہیں میں اپنے اوپر قابو رکھ سکوں یا نہ رکھ سکوں' تو مجھے تو آپ اس امتحان میں نہ ڈالیے۔ مفسرین نے یہاں خاص طور پر اس واقعہ

کا ذکر کیا ہے۔ یہ تاویلِ خاص ہو گی' لیکن تاویلِ عام اس واقعہ کی محتاج نہیں ہے' بلکہ وہ خود اپنی جگہ پوری طرح واضح ہے کہ درحقیقت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پکار کے جواب میں عذر پیش کرنا اور رخصت طلب کرنا ایک کمزوری کی علامت ہے' اور خاص طور پر جنہوں نے نفیر عام کے اس موقع پر رخصت چاہی وہ تو گویا اپنی ناکامی پر مہر تصدیق پہلے ہی ثبت کروا چکے۔ اللہ تعالیٰ ان کیفیات سے ہمیں اپنی امان میں رکھے۔ آمین!

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم' ونفعنى واياكم بالآيات والذكر الحكيم

☆ — ☆ — ☆



# اُمراء کا اپنے رُفقاء کے ساتھ طرزِ عمل اور اُسوۂ رسول ﷺ

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بعدُ:

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝۲۱۴ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۱۵ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۲۱۶ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝۲۱۷﴾ (الشُّعراء)

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۸﴾ (الحجر)

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝۲۸﴾ (الکہف)

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۲ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝۵۳ وَاِذَا جَاۗءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًاۢ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵۴﴾ (الانعام)

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ

﴿لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿١٥٩﴾﴾ (آل عمران)

اس درس کے تین حصے ہیں اور ہر حصے میں قرآن حکیم کے دو دو مقامات شامل ہیں اور اس کے لیے قرآن مجید کے چھ مختلف مقامات سے آیات منتخب کی گئی ہیں۔ چنانچہ اس درس کے مضامین کو تین ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

## ۱) نرمی، شفقت اور احترام کا برتاؤ

سورۃ الشعراء اور سورۃ الحجر کی آیات میں حضور ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنے بازو ان لوگوں کے لیے جھکا کر رکھیے جو اہل ایمان میں سے آپؐ کا اتباع کر رہے ہیں۔ سورۃ الشعراء میں ارشاد ہوا: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢١٥﴾﴾ ''اور (اے نبیؐ!) اپنے کندھوں کو جھکا کر رکھیے ان لوگوں کے لیے جو آپؐ کی پیروی کرتے ہیں اہل ایمان میں سے''۔ اور سورۃ الحجر میں فرمایا: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٨﴾﴾ ''اور (اے نبیؐ!) اپنے کندھے جھکا کر رکھیے اہل ایمان کے لیے''۔ ان آیات میں مزید کوئی وضاحت نہیں کی گئی، صرف یہی کہا گیا ہے کہ ''اہل ایمان کے لیے اپنے شانوں کو جھکا کر رکھیے!''

سورۃ الشعراء میں جو ''مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ'' آیا ہے تو یہ مِنْ تبعیضیہ بھی ہو سکتا ہے اور بیانیہ بھی۔ مِنْ تبعیضیہ ہونے کی صورت میں اس سے مراد یہ ہوگی کہ اگرچہ کہنے کو تو سبھی مسلمان ہیں، لیکن آپؐ کو جو اس طرزِ عمل کا حکم دیا جا رہا ہے وہ صرف ان کے لیے ہے جو آپؐ کے بالفعل متبعین ہیں۔ یہاں گویا تخصیص ہو جائے گی کہ قانونی طور پر تو منافقین بھی مسلمان ہیں، لیکن ان کے لیے یہ طرزِ عمل مطلوب نہیں، بلکہ ان کے لیے برعکس طرزِ عمل اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے جو سورۃ التوبۃ اور سورۃ التحریم میں بایں الفاظ بیان ہوا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ (التوبۃ:۷۳ و التحریم:۹) ''اے نبی (ﷺ)! کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کیجیے (کشمکش کیجیے) اور اُن پر سختی



کیجیے!''، یعنی منافقین کے ساتھ تو وہ معاملہ ہونا چاہیے جو کفار کے ساتھ ہے۔ ان کے ساتھ بھی کشمکش کیجیے، جہاد کیجیے اور اُن پر سختی کیجیے۔ جیسے کفار کے ضمن میں فرمایا: ﴿وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً﴾ (التوبۃ:۱۲۳) ''اور ہونا یہ چاہیے کہ وہ تمہارے اندر (اپنے لیے) سختی پائیں''۔ لہٰذا اس حوالے سے ''مِنْ'' تبعیضیہ ہے۔ اور یہ ''مِنْ'' بیانیہ بھی ہو سکتا ہے، یعنی اہل ایمان جو آپؐ کی اتباع کریں۔

اب چاہے اسے مِنْ تبعیضیہ مانا جائے یا مِنْ بیانیہ، نتیجے کے اعتبار سے قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اصل حکم ان کے لیے نرمی، شفقت اور احترام کا ہے۔ انہیں اللہ کا عطیہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ نے انہیں میری نصرت و اعانت کے لیے پسند کیا اور چن لیا ہے۔ کسی بھی داعی اور امیر کا اپنے تمام رفقاء اور ماتحتوں کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ ہونا چاہیے! ہر صاحب امر اور ذمہ داری کے منصب پر فائز ہر انسان کو اپنے ماتحت معاونین اور ساتھیوں کے ساتھ یہی رویہ رکھنا چاہیے، تاکہ انہیں بھی محسوس ہو کہ ان کے دلوں میں ان کی وقعت ہے، یہ ان کی قدر کرتے ہیں اور ان پر شفقت کرتے ہیں۔ نوٹ کیجیے کہ یہاں وہی الفاظ آئے ہیں جو سورۂ بنی اسرائیل میں والدین کے ساتھ طرزِ عمل کے ضمن میں آئے ہیں کہ ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿٢٤﴾﴾ ''اور جھکا دو اُن دونوں (والدین) کے لیے تواضع و انکسار کے شانے رحمت سے اور دعا کرو کہ اے میرے ربّ! ان دونوں پر رحم فرما جس طرح انہوں نے میری بچپن میں پرورش کی''۔ اس سے متصلاً قبل فرمایا: ﴿فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿٢٣﴾﴾ ''پس انہیں اُف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو اور ان سے بات کرو تعظیم کے ساتھ''۔ اب وہی طرزِ عمل ''خَفضِ جَنَاح'' کے الفاظ میں یہاں پر ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا جو بھی کسی چھوٹی یا بڑی جمعیت کا ذمہ دار شخص ہو، جو بھی اجتماعیت پر امیر ہو، خواہ بڑی تعداد میں لوگ اس کی تحویل میں ہوں یا تھوڑی تعداد میں، اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کا طرزِ عمل اس طرح کا ہونا چاہیے۔

آگے فرمایا: ﴿فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٢١٦﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى

الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ ''پھر اگر یہ آپ کی نافرمانی کریں تو کہہ دیجیے کہ میں تو اس سے بَری ہوں جو طرزِ عمل تم اختیار کر رہے ہو۔ اور آپؐ اُس ذات پر توکل کیجیے جو عزیز بھی ہے رحیم بھی ہے''۔ یعنی مأمورین اگر کوئی نافرمانی کرتے ہیں تو بھی انسان ان سے اپنا اظہارِ براء ت تو ضرور کر دے کہ میں تمہارے اس عمل سے بری ہوں' لیکن اس سے کوئی تشویش نہ ہو۔ اس لیے کہ معاملہ توکل کا کُل کا کُل اللہ کے حوالے ہے' البتہ اپنا توکل اللہ پر رکھو' اپنی گنتی پر نہ رکھو' اپنے ساتھیوں سے زیادہ امیدیں وابستہ ہی نہ کرو' امید وابستہ کرو تو صرف اللہ کی ذات سے۔ جیسے اقبال نے کہا ؎

بُتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

جس شخص کی امید انسانوں سے وابستہ ہو جاتی ہے جب ان کی طرف سے اس کی امید کے برعکس رویہ ظاہر ہوتا ہے تو اس پر ردّعمل کے طور پر مایوسی طاری ہوتی ہے اور اس کے قویٰ جواب دے دیتے ہیں' اعصاب شل ہو جاتے ہیں۔ اور جس کی ساری امید اللہ ہی کی ذات کے ساتھ ہو اُس صورتِ حال میں اس کا طرزِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کے غلط طرزِ عمل سے وقتی طور پر افسوس ہونا تو بالکل فطری بات ہے' لیکن اس پر کوئی مستقل منفی اثرات مترتب نہیں ہوں گے' اس لیے کہ اس کا توکل کُل کا کُل اللہ پر ہے' اپنے ساتھیوں پر نہیں۔

یہ مضمون چونکہ آگے آ رہا ہے اس لیے اِس وقت میں نے آیت کے صرف اس حصے کو بیان کیا ہے کہ ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾﴾ اس میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امراء سے اپنے مأمورین کے حق میں جو روش درکار ہے اس کا ایک وصفِ لازم ''خفضِ جَنَاح '' ہے' یعنی ان کے سامنے اپنے کندھے رحمت اور شفقت سے جھکا کر رکھنا' ان کے سامنے تواضع اختیار کرنا' تحکمانہ لہجہ اور انداز اختیار نہ کرنا۔

## ۲) کم حیثیت ساتھیوں کی دلجوئی

امراء کے لیے دوسرا مطلوبہ وصف خاص طور پر اُن ساتھیوں کی دلجوئی ہے جن کا تعلق



معاشرے کے نچلے طبقات سے ہو۔ یہ کسی اجتماعیت کے اندر ایک بڑا عملی مسئلہ ہوتا ہے جس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ ایک طرف تصوریت (idealism) ہے اور دوسری طرف حقیقت پسندی (realism)' ان دونوں چیزوں کو بیک وقت تھام کر رکھنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ہے۔ حقیقت پسندی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو عالمِ اسباب بنایا ہے اور اس کے لیے جو بھی قانون اللہ نے بنا رکھا ہے اس کے اعتبار سے کسی بھی انقلابی جدوجہد میں صاحبِ حیثیت لوگ آئیں گے تو گاڑی چلے گی' صاحبِ ثروت لوگ آئیں گے تو وسائل جمع ہوں گے' صاحبِ وجاہت لوگ آئیں گے تو کچھ لوگ ان کے اثرات کی وجہ سے کھنچ کر آ جائیں گے۔ یہ حقیقت پسندی (realism) ہے' اور اسے نظر انداز کرنا غلطی ہوگی' یہ اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارنے کے مترادف ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے خاص طور پر دعا کی کہ اے اللہ! عمرو بن ہشام اور عمر بن خطاب میں سے ایک کو تو ضرور میری جھولی میں ڈال دے۔ آپ ﷺ نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ ان حضرات کی معاشرے میں ایک حیثیت تھی' ایک مقام تھا۔ پھر یہ کہ ان کا ایک کردار تھا' ایک دفعہ جو بات تسلیم کر لیتے اس پر کٹ مرنے کو تیار تھے۔ ایسے باہمت اور باعزیمت لوگ آگے آئیں تو تحریک یا اجتماعیت کی گاڑی چلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص بلند ترین تصوریت کے آسمان پر پہنچ جائے اور وہاں سے نیچے ہی نہ اترے اسے تو یہ بات قابلِ اعتراض نظر آئے گی کہ اللہ کے رسول ﷺ طائف گئے اور وہاں صرف تین سرداروں سے ملے۔ کیا صرف ان کو دوزخ کی آگ سے بچانا مطلوب تھا؟ کیا وہاں کی عوام کا حق نہیں تھا؟ نبی کی دعوت تو عام ہونی چاہیے' اسے تو ایک ایک انسان کو جہنم کی آگ سے بچانا مطلوب ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا: ((لَاَنْ يَهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ))[1] ''اگر ایک انسان کو بھی اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بڑھ کر دولت

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ' باب مناقب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ وصحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابة' باب من فضائل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

ہے''۔کیا طائف میں اور انسان نہیں تھے؟ یہ وہ واقعیت پسندی اور حقیقت پسندی (realism) ہے جسے میں سمجھانا چاہ رہا ہوں۔ میں نے یہ انداز اس لیے اختیار کیا ہے تاکہ مسئلہ واضح ہو جائے کہ یہ چیزیں عملی طور پر ہوتی ہیں۔

انقلابی دعوت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اوّلاً اعلیٰ طبقات کو اپنا ہدف بناتی ہے' لیکن اس میں تعداد کے اعتبار سے زیادہ نچلے طبقات سے لوگ آتے ہیں' یعنی غرباء' فقراء' غلام' مسکین' اس لیے کہ ان کے پاؤں کی بیڑیاں اتنی بھاری نہیں ہوتیں جتنی سرمایہ داروں اور سرداروں کے پاؤں میں بھاری بیڑیاں پڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ اگر اس دعوت کو قبول کرتے ہیں تو ان کی دولت' حیثیت اور وجاہت متاثر ہوتی ہے' سرمایہ جاتا ہے' سرداری جاتی ہے' چودھراہٹ جاتی ہے۔ آپ نے حضرت مسیح علیہ السلام کا جملہ سنا ہوگا کہ ''اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر سکتا ہے لیکن کوئی دولت مند انسان آسمانی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا''۔ یہ اگرچہ قاعدہ کلیہ تو نہیں ہے' لیکن یہ ایک عظیم حقیقت ضرور ہے۔ تو ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھیے۔ اعلیٰ طبقات سے جو لوگ آتے ہیں ان میں سے ایک ایک لاکھ کے برابر ہوتا ہے۔ حضراتِ ابوبکر' عثمان' طلحہ' زبیر' سعد بن ابی وقاص' عبدالرحمٰن بن عوف' سعید بن زید رضوان اللہ علیہم اجمعین کا جو مقام ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں آپ عشرہ مبشرہ کہتے ہیں۔ بعد میں ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ایمان لا کر شامل ہوئے۔ لیکن یہ تو چھٹے سال کی بات ہے' جبکہ مقدم الذکر وہ لوگ ہیں جو شروع میں ایمان لائے اور ان میں سے ہر ایک کا جو مقام ہے وہ ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن جو فقراء و غرباء رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ایمان لائے ان میں ہر ایک کی خواہش تھی کہ آپ ﷺ کی عنایت مجھ پر ہو اور ہم آپ ﷺ کی توجہ کا مرکز بنیں' جبکہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس تحریک کی اپنی ایک مصلحت تھی۔ فرض کیجیے کہ فقراء اور مساکین آپؐ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اُس وقت کوئی قریشی سردار آ گیا ہے تو اُس وقت آپؐ اس کی طرف التفات فرمائیں گے۔ یہ اس حقیقت پسندی کا تقاضا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ ان فقراء اور مساکین کے دلوں پر چرکا لگے اور انہیں گمان ہو کہ کہیں ان کی نگاہ میں بھی دولت ہی کا تو اصل مقام نہیں ہے؟ کیا



(معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ) ان کی نگاہ میں بھی دنیاوی مال و دولت اور وجاہت کی وہی قدر و قیمت ہے جو دوسروں کی نگاہوں میں ہے؟ تو اس سے شک و شبہ پیدا ہوگا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ تھا' جس سے سورۂ عبس کا آغاز ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ﴿۱﴾ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ﴿۲﴾ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ﴿۳﴾ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ﴿۶﴾ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ﴿۸﴾ وَهُوَ يَخْشٰى ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ﴿۱۰﴾ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾﴾

''ترش رو ہوا اور بے رُخی برتی۔ اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ (اے نبیؐ!) تمہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے' یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نفع بخش ہو! جو شخص بے پروائی برتتا ہے' اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو' حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے' اور ڈر رہا ہوتا ہے' تو اس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے۔ پس جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں' بلند رتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں' معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں''۔

اس انداز میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص شانِ جلالی ظاہر ہو رہی ہے۔ کچھ قریشی سردار بیٹھے ہوئے تھے اور حضور ﷺ ان سے گفتگو فرما رہے تھے۔ اس دوران حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم آ گئے جو ایک نابینا صحابی تھے۔ وہ دیکھ بھی نہیں سکتے کہ صورتِ حال کیا ہے۔ وہ اب بار بار حضور ﷺ کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں' جبکہ حضور ﷺ قریشی سرداروں سے محو گفتگو ہیں۔ ان سے حضور ﷺ کی (معاذ اللہ) کوئی ذاتی غرض نہ تھی' بلکہ ان غرباء اور فقراء کی مصلحت بھی اس میں تھی کہ یہ صاحب حیثیت لوگ ایمان لے آئیں تو انہیں کچھ تحفظ حاصل ہو۔ دین کی مصلحت بھی اس میں تھی کہ اقامت دین کی گاڑی آگے چلے گی۔ لیکن اُس وقت حضور ﷺ

کو ذرا سی ناگواری ہوگئی تو اس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی کہ آپؐ کو یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اس کا ایک اور رُخ بھی ہے کہ کفار اسے غلط رنگ دیتے تھے کہ اے محمدؐ! ہم تو آپؐ کے پاس آنا چاہتے ہیں' لیکن آپ نے ہمارے ان غلاموں کو جن کی کوئی حیثیت ہی نہیں' اپنے گرد جمع کر رکھا ہے تو ہم کیسے آئیں! بہرحال ہمارا ایک مقام ہے۔ ہم اپنے مرتبے سے گر کر اِن لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے' لہٰذا اگر ہم سے گفتگو کرنی ہے تو ان کو ہٹائیے۔ یہ ان کی چال تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے اندر بددلی پیدا ہو اور جو جمعیت اکٹھی ہوئی ہے وہ بھی ساتھ نہ رہے اور ہم نے تو ساتھ دینا ہی نہیں ہے۔ یہ واقعہ قرآن مجید میں تفصیل سے آیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے خاص طور پر ان کی قوم کے سرداروں نے کہا تھا کہ ﴿وَمَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ﴾ (ھود:۲۷) ''اور ہم یہی دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذِل تھے' بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے''۔ یہ جو تمہارے گرد کچھ لوگ جمع ہیں یہ تو ہمارے گھٹیا درجے کے لوگ ہیں۔ اور یہ چشم سر سے دکھائی دے رہا ہے کہ کون لوگ تمہارے گرد جمع ہو گئے ہیں' ان کے اوپر گھمنڈ نہ کرنا' ان کی ہمارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔

تو یہ ایک نفسیاتی پیچیدگی ہے جو ہر تحریک کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور عملاً یہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ مسائل ایک طرح سے اس دنیا میں پل صراط کی مانند ہیں جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ تھوڑا سا اِدھر ہو جائیں تو بھی تباہی ہے اور تھوڑا سا اُدھر ہو جائیں تو بھی تباہی ہے۔ ایک طرف Idealism ہے اور دوسری طرف Realism ہے۔ ایک طرف واقعہ یہ ہے کہ اصل اہمیت تو تقویٰ' خشیت' انابت اور ایمان کی ہے اور دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں کسی چیز کی کامیابی کا دار و مدار اگرچہ بالکلیہ تو اللہ پر ہے لیکن اس کے جو بالفعل عوامل ہیں ان میں حیثیت اور وجاہت جیسی چیزیں بھی شامل کی جاتی ہیں۔ ان دونوں کے مابین ایک معتدل روش اختیار کرنے کے لیے بڑی بیدار مغزی اور فہم و فراست کی ضرورت ہے۔ اس میں تھوڑا سا اِدھر اُدھر ہو جانا



قرین قیاس ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی بھی اس معاملے میں گرفت ہوئی ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد! ہم سے تو خطا کا امکان سو گنا زیادہ رہے گا۔ تاہم اگر اصولی بات سامنے رکھتے ہوئے انسان اس معاملے میں متوازن رویہ قائم کرنے کی کوشش کرتا رہے تو اس کے لیے مفید ہوگا کہ قرآن حکیم کے ان مقامات کو اپنے سامنے رکھے جن میں اس کے لیے ہدایات موجود ہیں۔

اس ضمن میں سورۃ الکہف میں ارشاد ہوا ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ ''اور روکے رکھیے اپنے آپ کو (تھامے رکھیے اپنے آپ کو) ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے ربّ کو صبح و شام پکارتے ہیں' وہ اُسی کے روئے انور کے طالب ہیں (اس کی رضا چاہتے ہیں)''۔ انسان کسی سے خوش ہوتا ہے تو اپنے پورے رُخ کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی سے ناراض ہیں تو رُخ دوسری طرف کر لیں گے اور بات کریں گے بھی تو آنکھوں میں آنکھیں نہیں ملائیں گے' بلکہ ذرا مغائرت کے ساتھ جواب دیں گے' اس سے زیادہ التفات نہیں ہوگا۔ چنانچہ اللہ کا رُخ چاہنا یا اللہ کے روئے انور کا طالب ہونا سے مراد ہے اس کی عنایت' شفقت اور محبت کی طلب کرنا کہ اللہ ان سے راضی ہو جائے' ان پر اللہ کی نظر کرم ہو۔ وہ اس کی عنایتوں کے طالب رہتے ہیں اور صبح و شام اس کو پکارتے رہتے ہیں۔ آگے فرمایا ﴿وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ﴾ ''اور ان سے اپنی نگاہ نہ پھیریئے''۔ آپؐ دوسروں کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ آپ کی توجہ کا اصل مرکز یہ ہونے چاہئیں' ان کی تربیت اور تزکیہ کیجیے' ان کو بہتر سے بہتر کیجیے! ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب تک پہنچانے کے لیے مسلسل کوشاں رہیے اور ان سے اپنی توجہ کو ہٹائیے نہیں۔

آگے فرمایا ﴿تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ''کیا تم دُنیوی زندگی کی زینت چاہتے ہو؟'' یہ قرآن مجید کے مشکل مقامات میں سے ہے۔ لفظی ترجمہ تو یہ ہوگا کہ ''تم چاہتے ہو دنیا کی زندگی کی چمک دمک''، لیکن ہم اس کی تاویل اس طرح کریں گے کہ آپؐ کے ظاہری طرزِ عمل سے لوگوں کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ آپ بھی (معاذ اللہ) دُنیوی زینت کے طلب گار ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کے یہاں تو ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ'' کی رو سے طرزِ

عمل کا معاملہ نیت پر موقوف ہے اور اللہ آپؐ کی نیت کو جانتا ہے۔لیکن دنیا تو ظاہر سے فیصلہ کرتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپؐ کے ساتھی یہ سمجھیں کہ ہماری طرف نگاہِ کرم نہیں ہے' بلکہ نظرِ التفات ان صاحب حیثیت لوگوں کی طرف ہے اور شاید آپؐ کے دل میں بھی انہی چیزوں کی قدر و قیمت ہے۔ چلیے یہ تو اپنے ہیں' آپؐ ان کی غلط فہمی رفع کر دیں گے' لیکن آپ کے مدّ مقابل بھی تو اسی مغالطے میں مبتلا ہو جائیں گے کہ ان کی اقدار اور ترجیحات بھی وہی ہیں جو ہماری ہیں' ان کی نگاہ میں بھی انہی چیزوں کی قدر و قیمت ہے جن کی ہماری نگاہوں میں قدر و قیمت ہے۔تو یہ درحقیقت اس اندیشے کا سدّ باب ہے۔اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ محمدٌ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر (معاذ اللہ) الزام عائد کر رہے ہیں کہ آپ بھی فی الواقع حیاتِ دُنیوی کی زینت کے طالب ہیں۔

آگے ارشاد فرمایا:﴿ وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا ﴾ ''اور آپؐ اس کا کہنا نہ مانیے جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے''۔نوٹ کیجیے یہاں الفاظ ہیں کہ انہیں ہم نے غافل کیا ہے' اصل میں وہ ہمارے یہاں سے مردود اور راندۂ درگاہ ہو چکے ہیں۔ جیسے قرآن میں اہل ایمان کے لیے الفاظ ہیں کہ ''اللہ نے انہیں پسند کر لیا ہے'' اسی طرح جن کو یہ توفیق نہیں ملی گویا اللہ نے انہیں ردّ کر دیا ہے۔اللہ نے انہیں آپؐ کی رفاقت و اعانت کے قابل ہی نہیں سمجھا تو ان کے دلوں کو اپنی یاد سے غافل کر دیا۔اب اگر وہ صاحب حیثیت ہیں یا اصحابِ سیادت و قیادت ہیں تو بھی آپؐ ان کو چنداں اہمیت نہ دیجیے اور ان کی بات نہ سنیے! میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں امر کے معانی حکم اور مشورہ دونوں کے آتے ہیں۔اسی طرح اطاعت کا معنی بالفعل کسی کی بات پر عمل کر لینا بھی ہے اور دلی آمادگی سے کسی کی بات بالفعل سن لینا بھی ہے۔تو یہاں وَلَا تُطِعۡ کا ترجمہ ہوگا کہ ''آپ ان کی بات پر کان ہی نہ دھریئے''۔وہ لوگ آتے تھے اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو طرح طرح کی مصلحتیں سمجھاتے تھے' مداہنت کی کوشش کرتے تھے۔بار بار سفارتیں آ رہی ہیں' قریش کے بڑے بڑے سردار وفد کی صورت میں آتے تھے اور کہتے تھے کہ اے محمد (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم)! جہاں آپ اشارہ کر دیں وہاں آپؐ کی شادی کر دی جائے گی' آپ جتنی کہیں گے دولت کا ڈھیر



آپ کے قدموں میں لگا دیں گے' اور (معاذ اللہ) اگر آپ بادشاہ بننے کی ہوس میں ہیں تو اگرچہ آج تک کوئی ہمارا بادشاہ نہیں ہے اور ہم کسی کو بادشاہ تسلیم کرنے کے خوگر اور عادی نہیں ہیں' حریت ہمارے مزاج کا ایک جزوِ لاینفک ہے' لیکن ہم آپ کو بادشاہ مان لیتے ہیں۔ ہماری طرف سے یہ تمام پیشکشیں موجود ہیں۔تو فرمایا گیا کہ اس طرح کی بات سننا بھی خطرے کی علامت ہے۔آپ انہیں ایسا تأثر بھی نہ دیں کہ چلو بات سن تو رہے ہیں۔ اس سے انسان کو غلط امید وابستہ ہو جاتی ہے۔

مزید فرمایا﴿ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ ﴾ ''اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریقِ کار افراط و تفریط پر مبنی ہے''۔یعنی آپ ان کی بات پر توجہ بھی نہ فرمایئے جن کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے۔وہ راندۂ درگاہ ہیں' ہم نے انہیں مسلوب التوفیق کر دیا ہے۔اور وہ تو اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے تمام معاملات حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ ہر معاملے میں نظر آ رہا ہے کہ وہ کسی حد کے پابند نہیں ہیں' ان کی زندگی تو اس گھوڑے کی مانند ہے جس کی باگ ٹوٹ چکی ہو۔

یہی مضمون سورۃ الانعام میں آیا ہے۔فرمایا﴿ وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ ﴾ ''اور مت دھتکاریئے (اپنے سے دُور مت کیجیے) ان لوگوں کو جو اپنے ربّ کو صبح و شام پکارتے ہیں' وہ اس کے رُخِ انور (اس کی رضا) کے متلاشی ہیں''۔وہ اس کے نام کی مالا جپتے ہیں' اس کی تسبیح و تحمید و تہلیل کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں پنج وقتہ نماز کا نظام قائم نہیں ہوا تھا اور صرف صبح و شام کی نماز تھی۔آپ کو معلوم ہوگا کہ پنج وقتہ نماز کے نظام سے قبل کبھی دو اور کبھی تین وقت کی نماز تھی' بلکہ ابتدا میں تو صرف قیام اللیل ہی تھا۔پھر سورۂ بنی اسرائیل کے نزول کے بعد پنج وقتہ نظامِ صلوٰۃ قائم ہوا تو بات مختلف ہو گئی۔ یہاں صبح و شام اللہ کو پکارنے سے مراد صبح و شام کی نماز ہے۔

آگے ارشاد ہے:﴿ مَا عَلَيۡكَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ وَّمَا مِنۡ حِسَابِكَ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ ﴾ ''آپ پر ان کے حساب کی کچھ بھی ذمہ داری نہیں ہے اور نہ اُن پر آپ کے حساب کی کچھ ذمہ داری ہے''۔ایک جگہ اہل ایمان سے یوں خطاب ہوا ہے:

﴿فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ﴾ (النور:۵۴) ’’(لوگو!) ان (حضور ﷺ) پر تو وہی ذمہ داری ہے جس کا بوجھ ان پر ڈالا گیا ہے (وہی اس کے مسئول ہوں گے) اور تم پر وہ ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے (اس کے مسئول تم ہی ہو)‘‘۔ تو یہاں حضور ﷺ سے خطاب ہے اور بصیغہ غائب اہل ایمان کا ذکر کیا گیا ہے کہ آپ پر ان کے حساب کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے‘ وہ کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے وہ اپنا حساب اللہ کے ہاں خود دیں گے‘ اور نہ آپ کے حساب میں سے کسی شے کی مسئولیت ان پر ہے۔ آپؐ کو اپنا کام کرنا ہے اور آپؐ کا کام ہے پہنچا دینا۔ ﴿اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ﴾ (الشوریٰ:۴۸) ’’آپ پر نہیں ہے مگر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری‘‘۔ اب کون قبول کرتا ہے کون نہیں کرتا اس کی کوئی جواب دہی آپ سے نہیں ہے۔ ابوجہل نے کیوں نہیں مانا‘ بلالؓ نے کیوں مان لیا؟ اس سے آپ کا سروکار نہیں ہے۔ یہ یا تو اُن کا ارادہ ہے یا اللہ کی توفیق‘ دو ہی عوامل ہیں۔ آپ بلا تفریق اور بلا کم و کاست پہنچا دیجیے۔ اب کسے اللہ نے توفیق دی اور کسے ردّ کر دیا‘ یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کون ردّ کیے جانے کے قابل تھا۔ نہ آپؐ کے ذمہ ان کے حساب میں سے کوئی شے ہے اور نہ ان پر آپ کے حساب میں سے کوئی ذمہ داری ہے۔ ﴿فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾﴾ ’’تو اگر آپ انہیں دھتکار دیں گے تو (معاذ اللہ) آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے‘‘۔

آگے ارشاد ہوا ﴿وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا﴾ ’’اور اسی طرح ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے‘ تاکہ یہ (انہیں دیکھ کر) کہیں کہ کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ نے ہمارے درمیان میں سے بڑا احسان فرمایا ہے؟‘‘ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی اچھی بات ہوتی تو ہم قبول کرتے۔ یہ غریب غرباء‘ غلام‘ بے حیثیت لوگ‘ کیا یہ ہیں جن پر اللہ کا کرم ہوا؟ اگر یہ ایسے ہی اللہ کے لاڈلے اور پیارے تھے تو ان پر پہلے اللہ کا فضل و کرم کیوں نہیں ہوا اور کیوں انہیں اللہ نے مفلسی میں ڈالا ہوا تھا؟ کیوں ان کو فاقوں میں مبتلا کیا ہوا تھا؟ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر دنیا میں کسی کو کوئی حیثیت حاصل ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ



اس پر مہربان ہے۔ تو چونکہ اللہ دنیا میں ہم پر مہربان ہے تو یہ شے اگر واقعتاً قیمتی ہوتی تو ہمیں ملتی‘ انہیں نہ ملتی۔ یہ وہ بات ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا کہ اللہ نے ان کو ان کے ذریعے آزمائش میں ڈالا ہے اور وہ ان کے لیے اس حق کے پہچاننے میں ایک اوٹ بن گئے ہیں۔ آگے فرمایا ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾﴾ ’’کیا اللہ تعالیٰ خوب واقف نہیں ہے اپنے ان بندوں سے جو شکر کرنے والے ہیں؟‘‘ اللہ ان کو خوب جانتا ہے جو اس حق (قرآن) کی اصل قدر و قیمت سے واقف ہیں اور اس کا شکر ادا کرنے والے ہیں۔

اب سورۃ الانعام کی اگلی آیت میں ایک اضافی بات آ رہی ہے۔ فرمایا: ﴿وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ ’’اور جب آپ کے پاس (اے نبیؐ!) آئیں وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہیے: تم پر سلامتی ہو‘ تمہارے ربّ نے (تمہارے لیے) اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے‘‘۔ اب یہاں وہی نقشہ آ رہا ہے جو پہلے حصے میں تھا‘ یعنی شفقت اور تبشیر کا انداز۔ نبی اکرم ﷺ کی دعوت کے دونوں پہلو ہیں‘ جہاں انذار ہے وہاں تبشیر بھی ہے۔ آپؐ اپنے ساتھیوں کے لیے مبشر تھے‘ حوصلہ افزائی فرمانے والے تھے۔ ظاہر ہے بشارت کے اور کون مستحق ہوں گے؟ اب اس بشارت اور رحمت کا مظہر کیا ہے؟ فرمایا: ﴿اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾﴾ ’’یہ کہ اگر تم میں سے کوئی جہالت کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھے‘ پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو وہ (اللہ تعالیٰ) معاف کرنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے‘‘۔

یہاں ’’اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ‘‘ میں ’’مِنْكُمْ‘‘ اہم ہے۔ یعنی جن لوگوں نے رُخ ہی غلط اختیار کیا ہوا ہے تو اب اگر ان کی کوئی نیکی بھی ہے تو وہ کسی کھاتے میں نہیں‘ جبکہ تم سیدھے راستے پر آ گئے ہو‘ تم نے اپنا رُخ درست کر لیا ہے‘ تم نے وہ منزل طے کر لی ہے کہ ﴿اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا﴾ (میں نے تو اپنا رُخ پھیر لیا ہے یکسو ہو کر اُس ہستی کی طرف جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے) تو اگر تم میں سے کسی سے کسی وقت کوئی خطا سرزد ہو جائے‘ کوئی غلط حرکت صادر ہو جائے

جہالت کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا۔ یہاں ’’بِجَھَالَۃٍ‘‘ کے لفظ کو بھی سمجھ لیجیے! اردو میں تو جہالت اَن پڑھ اور ناواقف ہونے کو کہتے ہیں‘ جبکہ عربی میں اگرچہ اس کا یہ مفہوم بھی ہے‘ لیکن یہ تابع ہے‘ اصل مفہوم یہ ہے کہ جذباتی ہونا‘ مشتعل مزاج ہونا۔ عمرو بن ہشام کو ابوجہل اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا ہی مشتعل مزاج اور اکھڑ مزاج آدمی تھا۔

یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر جذبات کی رو میں بہہ کر یا عدمِ واقفیت کی بنا پر انسان سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے‘ پھر اس کے بعد وہ اس سے توبہ کرے اور اپنی اصلاح کر لے‘ اپنے رویے کو درست کر لے‘ یہ نہیں کہ پرنالہ وہیں بہتا رہے‘ تو یقیناً اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے۔ [توبہ کا پورا تصور ہمارے منتخب نصاب (۱) کے درس میں جو کہ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع پر مشتمل ہے‘ آ جاتا ہے۔] یہ گویا کہ تبشیر و بشارت ہے کہ اللہ کی شانِ غفاری کو بار بار اُن کے سامنے لاتے رہنا کہ اگر خطا ہو گئی ہے تو کوئی بات نہیں ہے‘ تم بھی استغفار کرو‘ میں بھی تمہارے لیے استغفار کروں گا‘ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے گا۔ اُسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں امراء کی طرف سے اپنے ساتھیوں کی اسی طرح حوصلہ افزائی ہوتی رہنی چاہیے۔

## ۳) رأفت و رحمت اور خوئے دلنوازی

یہاں سے اب تیسرا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ وہی کیفیت جو پہلے حصے میں آئی تھی‘ یہاں اور زیادہ نمایاں ہو کر‘ زیادہ گاڑھی شکل میں نکھر کر اور ابھر کر سامنے آ رہی ہے۔ ایک تو سورۃ التوبۃ کے آخری حصے کی آیت ہے جو بڑی پیاری آیت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے اہل ایمان کے ساتھ معاملے کی شاید اتنی پیاری تعبیر آپ کو کہیں اور نہ ملے۔ اسی کا ایک عکس داعیٔ حق کے اندر اپنے ساتھیوں کے لیے ہونا چاہیے۔ کسی بھی چھوٹے یا بڑے امیر سے اپنے مأمورین کے لیے یہی کیفیات مطلوب ہیں‘ اس لیے کہ ہمارے لیے تو مشعل راہ اُسوۂ محمدیؐ ہی ہے‘ ہمیں چلنا تو آپ ﷺ ہی کے نقش قدم پر ہے۔ فرمایا جا رہا ہے: ﴿لَقَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ﴾ ’’(لوگو!) آ گئے ہیں تمہارے پاس ایک رسول تم ہی میں سے‘‘۔ مِنۡ اَنۡفُسِکُمۡ کے مختلف درجات ہوں گے۔ ہرگز یہ نہ سمجھئے کہ ہم ان میں نہیں



ہیں۔ اس کا مصداق پہلے درجے میں بنو ہاشم اور دوسرے درجے میں قریش ہیں‘ اس لیے کہ بنو ہاشم قریش کا ایک گھرانہ ہے۔ تیسرے درجے میں اہل عرب (اُمّیین‘ بنو اسماعیل) آئیں گے اور چوتھے درجے میں پوری بنی نوعِ انسانی ہے۔ اس لیے کہ آپ ﷺ بھی بنی آدم میں سے ہیں‘ حوا کے بیٹے ہیں۔ اس اعتبار سے اس میں درجہ بدرجہ تمام نوعِ انسانی شریک ہو جائے گی۔

آگے ارشاد ہے: ﴿عَزِیۡزٌ عَلَیۡہِ مَا عَنِتُّمۡ﴾ ’’بہت شاق گزرتی ہے ان پر وہ چیز جو تمہارے لیے تکلیف دہ ہے‘‘۔ جو چیز تم پر بھاری پڑ رہی ہو وہ اُن پر بہت گراں گزرتی ہے۔ وہ تو تمہارے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر چاہتے ہیں۔ اگر وہ تمہیں کھینچ رہے ہیں تو خیر کی طرف کھینچ رہے ہیں‘ ترغیب دے رہے ہیں تو بھلائی کے لیے دے رہے ہیں۔ بظاہر تمہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ تمہیں مشکل میں ڈال رہے ہیں۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ((حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّھَوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّۃُ بِالْمَکَارِہِ)) (۱) یعنی جہنم ایسی چیزوں سے چھپا دی گئی ہے جو نفس کو بہت مرغوب ہیں اور
جنت ایسی چیزوں سے گھیر دی گئی ہے جو نفس انسانی کو پسند نہیں ہیں۔ لیکن تم یہ کانٹوں بھری باڑ عبور کر کے ہی جنت میں داخل ہو سکو گے۔ وہ اگر تمہیں ان کانٹوں بھری باڑ کی طرف لے جا رہے ہیں تو درحقیقت وہ تمہیں اس جنت کی طرف لے جا رہے ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ﴾ ’’وہ تم پر بہت ہی حریص ہیں‘‘۔ یعنی تمہارے لیے ہر خیر کے طالب ہیں‘ ہر بھلائی کے جویا ہیں۔ یہاں نوٹ کیجیے کہ ابھی اہل ایمان کی تخصیص نہیں ہے‘ اہل ایمان کی تخصیص آگے چل کر آئے گی۔ یہ تو نبی اکرم ﷺ کی وہ قلبی کیفیت ہے جو پوری نوعِ انسانی کے لیے تھی۔ آپ ﷺ کا سینہ مبارک نہایت کشادہ ہے کہ ہر فردِ نوعِ بشر کے لیے آپؐ چاہیں گے کہ وہ سختی سے بچے اور اس کے لیے خیر و فلاح ہو‘ اس کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب ہوں۔ آنحضور ﷺ کے مزاج میں کوئی بخل نہیں ہے۔ اس لیے کہ سابقہ انبیاء و رُسل کے برعکس آپؐ پوری نوعِ انسانی کی طرف بشیر و نذیر بنا کر مبعوث

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب حجبت النار بالشھوات۔

فرمائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سابقہ انبیاء ورُسل کے ہاں ہمیں عالمگیر پیغام نہیں ملتا' بلکہ موجودہ انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف یہ الفاظ منسوب ہیں کہ ''یہ پیغام دوسروں کے لیے نہیں ہے''۔ اور ایسے سخت الفاظ بھی آئے ہیں کہ ''کوئی شخص اپنے بچوں کے حصے کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالتا' یہ تمہارے بچوں (یعنی بنی اسرائیل) کے لیے ہے''۔ یہ بھی آیا ہے کہ ''میں صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں''۔ اگرچہ ہم حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان الفاظ کی نسبت حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف درست ہے یا نہیں' لیکن منطقی طور پر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ آپ علیہ السلام کی بعثت بنی اسرائیل کی طرف تھی۔ قرآن مجید میں آپؑ کے لیے ﴿رَسُوۡلًا اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اور سوائے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی تمام رسول کسی نہ کسی معین قوم' قبیلے یا شہر کی طرف بھیجے گئے تھے۔ صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات اس سے مستثنیٰ ہے کہ جن کی بعثت عام ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا﴾ (سبا:۲۸) ''(اے نبیؐ!) ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر''۔ اس پہلو سے یہاں جامعیت ہوگی' اس لیے کہ دعوتِ حق کے لیے یہی کیفیت تو مطلوب ہے کہ یہ خیر خواہی کے جذبے سے ہو۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری نوعِ انسانی کو دعوت دینی ہے تو اگر پوری نوعِ انسانی کے لیے خیر خواہی نہیں ہوگی تو دعوت کا تقاضا ابتدائی درجہ میں بھی پورا نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا یہاں ابھی تخصیص نہیں ہے' بلکہ عموم ہے۔ اسی لیے میں نے ﴿لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ﴾ کے مفہوم میں اس کا دائرہ بنی ہاشم سے لے کر بنی آدم تک وسیع کیا ہے۔ اور ﴿عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ﴾ میں بھی پوری نوعِ انسانی آئے گی۔

البتہ آیت کا آخری ٹکڑا یہ ہے کہ: ﴿بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲۸﴾﴾ ''(آپؐ) مؤمنین کے حق میں انتہائی رؤف اور رحیم ہیں''۔ ''رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ'' کے الفاظ پر مکمل بحث سورۃ الحدید کے چوتھے رکوع کے ضمن میں ہوئی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ سورۃ الحدید کے پہلے رکوع میں رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ کی صفت اللہ کے لیے آئی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيۡ يُنَزِّلُ عَلٰى



عَبۡدِهٖۤ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخۡرِجَكُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۹﴾﴾ ''وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے' تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق ہے نہایت مہربان ہے''۔ اور سورۃ الحدید کے آخری رکوع میں یہ الفاظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے لیے آئے ہیں۔ فرمایا: ﴿وَجَعَلۡنَا فِيۡ قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ رَاۡفَةً وَّرَحۡمَةً ؕ﴾ (آیت ۲۷) ''اور ان کے دلوں میں ہم نے رأفت اور رحمت پیدا کر دی جنہوں نے آپ (علیہ السلام) کی پیروی کی''۔ جبکہ یہاں رؤف اور رحیم کے الفاظ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آئے ہیں۔ یہ جان لیجیے کہ رأفت اور رحمت ایک ہی کیفیت کے دو رُخ ہیں۔ پہلے کسی سے ہمدردی ہوتی ہے' پھر اس کی مدد کی جاتی ہے۔ پہلے کسی کے دکھ کو آپ اپنے اندر محسوس کریں' تب ہی تو آپ اس کی مدد پر آمادہ ہوں گے۔ ان کیفیات کو فزیالوجی میں sensory اور motor کہا جاتا ہے۔ یعنی پہلے آپ کو احساس ہوا کہ مجھے ہاتھ پر کسی چیز نے کاٹ لیا ہے' پھر آپ کا ہاتھ ایک دم وہاں سے ہٹا۔ ایک لمحے پر محیط یہ عمل دراصل اس طور سے انجام پاتا ہے کہ جہاں کاٹا گیا وہاں سے sensation دماغ میں گئی' دماغ نے اسے interpret کیا کہ وہاں کوئی تکلیف دہ شے ہے' وہاں سے فوراً ہاتھ جھٹک دینا چاہیے۔ وہاں سے احکام صادر ہوئے اور وہ motor nerves کے ذریعے ان عضلات تک پہنچے کہ حرکت کرو تاکہ ہاتھ یہاں سے ہٹ جائے۔ اسی طرح سے یہ ایک sensory پہلو ہے جس سے آپ کسی کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں۔ جیسے امیرؔ مینائی نے کہا: ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

''رأفت'' ﴿عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ﴾ کا مظہر ہے اور ''رحمت'' ﴿حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ﴾ کا مظہر ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں یہ دونوں مظہر اہل ایمان کے حق میں بتمام و کمال موجود تھے۔ ﴿بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ﴾ یعنی آپ اہل ایمان کے دکھ درد کو محسوس

کرنے والے اور ان کے حق میں انتہائی شفیق اور مہربان ہیں' دکھ درد کو دُور کرنے والے ہیں۔ یہ نبی اکرم ﷺ کی شان ہے اہل ایمان کے حق میں۔ اسی طرح جو بھی آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لوگوں کو دعوت دیتا ہے اسے اسی کا ایک عکس اپنے اندر پیدا کرنا ہو گا۔ جیسے اقبال نے کہا ہے کہ سالارِ کارواں کی اصل متاع یہی ہے کہ نفس گرم بھی ہو اور دل روشن بھی ہو' اپنے ساتھیوں کے حق میں بہت نرم خو ہو اور ان کے دلوں کو موہ لینے والا بھی ہو۔ یہ ساری کیفیات مطلوب ہیں۔

اب ہم سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ آیت اس سلسلے کی اہم ترین آیت ہے۔ فرمایا: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ ''(اے نبیؐ) یہ اللہ کی رحمت کا سبب ہے کہ آپؐ ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہیں''۔ اب تک ہم نے جن آیات کا مطالعہ کیا ہے ان میں رسول اللہ ﷺ کو ہدایات تھیں کہ آپ اہل ایمان کے لیے یہ طرزِ عمل اختیار کیجیے' جبکہ یہاں کہا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ فی الواقع مؤمنین کے لیے انتہائی شفیق اور رحیم ہیں۔ اب یہیں سے یہ موضوع شروع ہو رہا ہے کہ یہ سب اللہ کی رحمت اور شفقت کا مظہر ہے کہ اے نبیؐ! آپؐ اہل ایمان کے حق میں بہت نرم ہیں۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کا مزاج اور آپؐ کی طبیعت کی ساخت ہی اس طرح بنائی ہے۔ ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ ''اور اگر آپ سخت دل اور تندخو ہوتے تو یہ آپؐ کے گرد و پیش سے منتشر ہو جاتے''۔ جیسے اقبال نے کہا ہے:

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

اس کے برعکس اگر امیر کارواں میں خوئے دل نوازی ہو تو لوگ اس کے گرد کھنچے چلے آتے ہیں۔ بقول اقبال:

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں؟
فقط یہ بات' کہ پیر مغاں ہے مردِ خلیق!



تو اگر داعیٔ حق تندخو اور سنگ دل ہو تو لوگ منتشر ہو جائیں گے۔

اب اصل بات یہ ہے کہ کیا کرنا چاہیے! نرمی تو آپؐ کے دل میں ہے' لیکن اس نرمی کا ظہور کیسے ہو۔ اس کے لیے آپ ﷺ کو چار کام گنوائے جا رہے ہیں۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی: ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ''آپ انہیں معاف کرتے رہا کریں''۔ اس کی ضرورت ہر صاحب امر کو ہے' چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ سورۃ التغابن میں اہل وعیال کے بارے میں ہدایتِ قرآنی ہے: ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾﴾ ''اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو یقیناً اللہ غفور ہے رحیم ہے''۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل وعیال کی تربیت کے لیے معاف کرنے کی خُو نہایت مؤثر ہے۔ اس لیے کہ ہر وقت کا دنگا فساد' ڈانٹ ڈپٹ' اٹھتے بیٹھتے کی جھڑکی' یہ سب چیزیں گھر کے اندر میدانِ کارزار کا سا ماحول پیدا کرنے کے مترادف ہیں' اور ان سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔ اس سے ضد' ہٹ دھرمی اور اپنی غلطی پر اصرار جیسے برے نتائج نکلتے ہیں' انسان ڈھیٹ ہو جاتا ہے' شرم وحیا کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ تو یہاں پر بھی حکم دیا جا رہا ہے کہ: ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ''آپ (ﷺ) انہیں معاف کیا کریں''۔ یہ معاف کر دینا انسان کا شعوری فیصلہ ہونا چاہیے اور اپنے دل پر جو میل آیا ہوا سے دھو لینا چاہیے' ورنہ اس کھردری سطح پر میل جمع ہو جائے گا۔ لہٰذا انسان شعوری طور پر فیصلہ کرے کہ میں نے معاف کیا' اور کوشش کر کے دل سے اس میل کو نکال دے۔

دوسری بات فرمائی: ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ''اور ان کے لیے (اللہ سے) استغفار بھی کیا کریں''۔ یہ پہلی بات کا منطقی نتیجہ ہے۔ کیونکہ کسی کے لیے اللہ سے دعا اسی وقت ہو گی جب اس کی طرف سے دل صاف ہو گا۔ اس لیے کہ دعا کا اصل جوہر درحقیقت اخلاص ہے۔ اگر اخلاص نہیں ہے تو وہ دعا نہیں ہے' بلکہ ایک رسم ہے جو پوری کر دی گئی ہے۔ جبکہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ (المؤمن: ۶۵) ''پس اللہ کو پکارو اُس کے لیے اپنے دین کو خالص کرتے ہوئے''۔ تو جب تک اس شخص کے لیے فی الواقع آپ

کے دل میں یہ اخلاص پیدا نہ ہو تو چاہے آپ نے رٹے ہوئے الفاظ زبان سے ادا کر دیے لیکن استغفار کا حق ادا نہیں ہوگا۔ اس کا ایک عکس یہ بھی ہے کہ آپ استغفار کریں گے تو اس سے آپ کا دل بھی صاف ہوگا۔ تنہائی میں اگر آپ اپنے کسی ساتھی کی زیادتی پر جو اُس نے آپ پر کی ہو' اللہ سے استغفار کریں گے تو آپ کا دل میل سے بالکل صاف ہو جائے گا۔

تیسرے نمبر پر فرمایا ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ ''اور معاملات میں انہیں شریکِ مشورہ کیا کریں''۔ یہاں لفظ ''امر'' وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ یہ دراصل خاص طور پر کمزور اور ضعیف ساتھیوں کے لیے حکم دیا جا رہا ہے' کیونکہ سارا پس منظر انہی کے بارے میں ہے۔ ان کے لیے نرمی ہونی چاہیے' نہ یہ کہ درشتی' سختی اور ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ ہو۔ انہیں شعوری طور پر معاف کرنا ہے' ان کے لیے استغفار کرنا ہے۔ اور پھر ایسا بھی نہ ہو کہ تمہاری نگاہ میں ان کی قدر اس طرح گر جائے کہ اب انہیں مشوروں سے خارج کر دو۔ یہ تیسرا نتیجہ نکل سکتا تھا جس کا یہاں سدّ باب کیا گیا کہ اعتماد کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ اس لیے کہ انسان ہر چیز کا تأثر لیتا ہے۔ ایسا شخص لازماً یہ تأثر لے گا کہ اب میں ان کی good books میں نہیں رہا' یہ اب مجھ سے بات نہیں کرتے اور کبھی مجھ سے مشورہ نہیں کرتے۔ یہ چیز اُن کے دل کو آپ سے دور کرنے میں بڑی مؤثر ثابت ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ دلوں کے فاصلے اس اجتماعیت کے ضعف کا موجب ہوں گے جو آپ اللہ کے دین کے لیے قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لہٰذا انہیں بھی مشوروں میں شریک کیا کریں۔ کسی کو مشورے میں شریک کرنا درحقیقت اس پر اظہارِ اعتماد ہے۔ آدمی کو جن کے خلوص اور فہم پر اعتماد ہوتا ہے ان سے ہی وہ مشورہ کرتا ہے۔

اس ضمن میں چوتھی بات یہ فرمائی گئی کہ: ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ ''پھر جب آپ کسی چیز کا عزم کر لیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کیجیے!'' آپ ان کو مشورے میں ضرور شریک کیجیے' البتہ آپ پر کوئی اپنا فیصلہ ٹھونسنے والا نہیں ہے۔ مشورے کے بعد فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے۔ مشورہ اپنے نفس کے اعتبار سے ایسی چیز ہے کہ لازم نہیں کہ اس کو قبول کیا جائے۔ اس لیے تمام لوگوں کو مشورے میں شریک کرنے میں کیا حرج ہے؟ اگر ووٹوں کی گنتی سے



فیصلہ کرنا ہوتا تب تو آپ کو چھلنیاں لگانی ہوتیں کہ اگر سب پختہ و ناپختہ لوگوں کو مشوروں میں شریک کر لیا گیا تو غلط فیصلہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جب فیصلہ صرف امیر کے ہاتھ میں ہے تو پھر لوگوں کے اعتماد کو بحال کرنے کے لیے انہیں ضرور مشوروں میں شریک کیا جانا چاہیے!

بہت سے لوگوں نے یہاں خواہ مخواہ کھینچ تان کی ہے کہ امیر کے لیے مشورہ قبول کرنا لازم ہے۔ ان کے نزدیک گویا یہاں لفظ ہونا چاہیے تھا: ''فَإِذَا عَزَمْتُمْ'' شاید اللہ تعالیٰ بھول گیا (معاذ اللہ)۔ اور اگر یقین ہو کہ یہ اللہ کا کلام ہے جس میں کوئی شوشا بھی یوں ہی اللّ ٹپ نہیں آ گیا ع

''زیر ہر ہر لفظ غالبؔ چیدہ ام میخانہ''

اور

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیو!

جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

تو پھر ماننا پڑے گا کہ ''عَزَمْتَ'' میں یہ واحد مذکر حاضر کی ضمیر بڑی فیصلہ کن ہے۔ فرمایا جا رہا ہے: ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ ''پس جب (اے نبیؐ!) آپ فیصلہ کر لیں تو اللہ پر توکل کیجیے''۔ پھر یہ ہرگز نہ سوچیے کہ کس کی رائے مخالف تھی اور کس کی رائے حق میں تھی' اور یہ کہ اگر کسی کی رائے کے خلاف فیصلہ کر لیا تو اقامتِ دین کی گاڑی نہیں چلے گی۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿١٥٩﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بھروسہ کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے''۔ اللہ اپنے ان بندوں کو پسند کرتا ہے جو اپنے معاملے کو اُس کے حوالے کریں اور اسی پر توکل کریں' اور یہ یقین رکھیں کہ وہی ہوگا جو اللہ چاہے گا' باقی کسی کی ناراضگی اور رضامندی سے اور کسی کا ساتھ دینے یا نہ دینے سے کوئی فیصلہ کن فرق واقع نہیں ہوگا۔

بارك الله لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالایات والذکر الحکیم

☆ — ☆ — ☆

# امیر کے لئے ہدایات

باب أمر وُلاة الأمور بالرفق برعایاهم ونصیحتهم

والتواضع و خفض الجناح للمؤمنین

﴿وَاخفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الشعراء:٢١٥)

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (النحل:٩٠)

﴿يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (الحجرات :١٣)

1- عَنْ حَارِثَةَ بْنِ وهْبٍ رضِيَ اللّٰهُ عنه قَالَ :سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ((أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ؟ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ)) (متفق عليه)

حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے کہ ’’کیا میں تمہیں دوزخیوں کے بارے میں آگاہ نہ کروں؟ ہر وہ شخص جو سرکش ہو، اکڑ کر چلنے والا ہو اور تکبر کرنے والا۔‘‘

2- عن عبدِاللّٰه بن مسعُودٍ رضِيَ اللّٰه عنه، عن النبيِّ ﷺ قال :((لَا يَدْخُلُ الجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ )) فقالَ رَجُلٌ :إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَناً، ونَعْلُهُ حَسَنَةً؟ قال ((إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ ، اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وغَمْطُ النَّاسِ)) رواه مسلم

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ’’وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ایک رائی کے دانے جتنا تکبر ہو۔‘‘ ایک صحابی نے عرض کی :اے اللہ کے رسول ایک آدمی چاہتا ہے کہ اس کے



کپڑے جوتا خوبصورت ہو تو کیا یہ تکبر کی نشانی ہے؟ آپ نے فرمایا: ’’ہرگز نہیں بیشک اللہ تعالیٰ جمیل ہیں اور وہ خوبصورتی کو پسند فرماتے ہیں۔تکبر تو یہ ہے کہ حق کو جھٹلا دیا جائے اور لوگوں کو حقیر جانا جائے۔‘‘

**فائدہ**: انسان پر جب کوئی حقیقت واضح ہو جائے تو پھر اپنی عزتِ نفس اور انا اسے قبول کرنے میں آڑے نہیں آنی چاہئے اور تمام انسانوں کی عزتِ نفس جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے وہ مجروح نہیں ہونی چاہئے۔

3- عن أَبي هُرَيرةَ رضي اللّٰه عنه أَنَّ رسولَ اللّٰه ﷺ قَالَ ((إِنَّكُمْ سَتَحْرِصُوْنَ عَلى الْاَمَارَةِ، وسَتَكُوْنُ نَدَامَةً يَوْمَ القِيَامَةِ)) رواه البخاري

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’بیشک تم امارت پانے کی حرص اپنے اندر پاؤ گے لیکن امارت قیامت کے دن ندامت کا سبب بنے گی۔‘‘

4- عن أبي ذرٍ رضي اللّٰه عنه قال :قُلتُ يا رسولَ اللّٰهِ أَ لَا تَسْتَعمِلُنِي؟ فَضَرَبَ بِيَدِهِ عَلٰى مَنْكِبِي ثُمَّ قَالَ:((يَا أَبَا ذَرٍّ إِنَّكَ ضَعِيْفٌ ، وَإِنَّهَا أَمَانَةٌ وإِنَّهَا يَومَ القِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ، إِلَّا مَنْ أَخَذَهَا بِحَقِّهَا، وَأَدّٰى الَّذِي عَلَيْهِ فِيْهَا)) رواه مسلم

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: کیا آپ مجھے عامل نہیں بنائیں گے؟ اس پر آپؐ نے میرے کندھے کو تھپتھپایا اور فرمایا: ’’اے ابو ذر تم بہت کمزور ہو اور سرداری ایک امانت ہے اور یہ قیامت کے دن ندامت اور شرمندگی کا ذریعہ بنے گی، سوائے اس کے کہ وہ لے جس کا حق بنتا ہو اور پھر اس کی ذمہ داری ادا کرے۔‘‘

5- عَن عبدالرحمن بن سَمُرَةَ رضي اللّٰه عنه ، قال :قَالَ لِيْ رسولُ اللّٰه ﷺ ((يَا عَبْدَ الرَّحمن بن سَمُرَةَ لا تَسْأَلِ الْإِمَارَةَ ، فَإِنَّكَ إن أُعْطِيْتَهَا

عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا ، وَإِنْ أُعْطِيْتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِّلْتَ إِلَيْهَا،
وَإِذَا حَلَفْتَ عَلٰى يَمِيْنٍ فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْراً مِنْهَا، فَأْتِ الَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ،
وَكَفِّرْ عَنْ يَمِيْنِكَ)) متفق عليه۔

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے سمرہ امارت کومت چاہو، کیونکہ اگر یہ بغیر مانگے مل جائے تو اللہ کی مدد ساتھ ہوتی ہے اور اگر تم نے مانگ کر لی تو اس کے سپرد کر دیئے جاؤ گے اور اگر کسی چیز پر قسم کھا بیٹھو اور پھر اس سے بہتر چیز کو پاؤ تو قسم توڑ کر بہتر کو اختیار کر لو اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کرو۔''

6- عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رضی اللّٰه عنه قال كَأَنِّيْ أَنْظُرُ إِلٰى رسولِ اللّٰه ﷺ يَحْكِي نَبِيًّا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِم، ضَرَبَهُ قَوْمُهُ فَأَدْمَوْهُ، وَهُوَ يَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْهِهِ ، وَيَقُولُ ((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لا يَعْلَمُوْنَ)) متفق عليه

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا بیان میری نظروں میں ہے کہ آپؐ فرما رہے تھے کہ انبیاء میں سے ایک نبی کو ان کی قوم نے اتنا مارا کہ خون بہہ نکلا اور وہ اپنا خون چہرے سے صاف کرتے جاتے تھے اور ساتھ ہی دُعا کرتے جاتے تھے کہ اے اللہ میری قوم کو معاف فرما دے، یہ نادان حقیقت سے ناواقف ہیں۔

7- و عن عائشةَ رضی اللّٰه عنها قَالَتْ ماضَرَبَ رسولُ اللّٰه ﷺ شَيْئاً قَطُّ بِيَدِهٖ، وَلَا امْرَأَةً وَلَا خَادِماً، إِلَّا اَنْ يُّجَاهِدَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، وَمَا نِيلَ مِنْهُ شَيْءٌ قَطُّ فَيَنْتَقِمَ مِنْ صَاحِبِهٖ إِلَّا أَنْ يُنْتَهَكَ شَيْءٌ مِنْ مَحَارِمِ اللّٰه تعالٰى، فَيَنْتَقِمُ لِلّٰهِ تعالٰى۔ رواه مسلم

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی نہ اپنی بیویوں کو



اور نہ خادم کو مارا۔ اگر کسی کو مارا ہے تو اللہ کی راہ میں جہاد کے سلسلے میں....اور نہ کسی سے انتقام لینے کی طرف مائل ہوئے سوائے اس کے کہ کسی کو اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے روکنا مطلوب ہو تو اس بارے میں ضرور انتقام لیتے۔

8- وعَنْ أَبِي هُرَيرَةَ رضی اللّٰه عنه أَنَّ رَجُلاً قالَ لِلنَّبِي ﷺ أَوْصِنِيْ ، قَالَ: ((لَا تَغْضَبْ)) فَرَدَّدَ مِرَاراً، قال ((لَا تَغْضَبْ)) رواه البخاری

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک صحابی رسول ﷺ نے عرض کی کہ مجھے وصیت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا غصہ سے بچو۔ اُس نے کئی بار دہرایا، آپ نے یہی فرمایا غصہ چھوڑ دو۔

9- عَنْ عَائِشَةَ رضی اللّٰه عنها أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قال ((إِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ، وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ وَمَا لَا يُعْطِي عَلٰى مَا سِوَاهُ)) رواه مسلم

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ بیان کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''بیشک اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اور وہ مہربانی کو پسند فرماتا ہے اور نرم برتاؤ پر جو عطا کرتا ہے وہ سختی پر نہیں عطا کرتا اور نہ ہی کسی اور چیز پر ایسا عطا کرتا ہے۔

**فائدہ** : اللہ تعالیٰ کی نرمی اور مہربانی کی تو کوئی انتہا ہی نہیں۔ وہ تو سرکشوں کو باوجود پوری قدرت رکھنے کے عطا کرتا رہتا ہے۔ نافرمانوں کو نافرمانی کے باوجود رزق عطا کر رہا ہے۔

10- وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰه ﷺ لِأَشَجِّ عَبْدِ الْقَيْسِ :((إِنَّ فِيْكَ خَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللّٰهُ :اَلْحِلْمُ وَالْأَنَاةُ )) رواه مسلم

حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''اے عبدالقیس تو خوب آدمی ہے بے شک تیرے اندر دو خصلتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ

بہت پسند فرماتے ہیں۔ تحمل و بردباری اور سنجیدگی۔''

11- عَن عَبدِاللّٰہِ بْنِ عمرِو بنِ الْعَاص رضی اللّٰہ عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رسولُ اللّٰہ ﷺ ((إِنَّ الْمُقْسِطِينَ عِنْدَ اللّٰہِ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُورٍ، اَلَّذِيْنَ يَعْدِلُوْنَ فِي حُكْمِهِمْ وَأَهْلِيهِمْ وَمَا وَلُّوا)) رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو (حکمران) عدل وقسط قائم کرنے والے ہوں گے وہ نور کے منبروں پر جگہ دیئے جائیں گے۔ یہ وہ ہوں گے جو اپنے احکام میں عدل کرنے والے، اپنے اہل سے انصاف کرنے والے اور جن کے وہ ذمہ دار بنائے گئے ہوں ان میں عدل قائم کرنے والے ہوں گے۔''

12- عَنْ اَبِی مَرْيَمَ الأَزْدِيِّ رضی اللّٰہ عنہ، اَنَّهٗ قَالَ لِمُعَاوِيَةَ رضی اللّٰہ عنہ سَمِعْتُ رسولَ اللّٰہِ ﷺ يقول: ((مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ شَيْئاً مِنْ أُمُوْرِ الْمُسْلِمِيْنَ فَاحْتَجَبَ دُوْنَ حَاجَتِهِمْ وَخَلَّتِهِم وفَقْرِهِم، اِحْتَجَبَ اللّٰهُ دُونَ حَاجَتِهٖ وخَلَّتِهٖ وفَقْرِهٖ يَوْمَ القِيَامَةِ)) فَجَعَلَ مُعَاوِيَةُ رضی اللّٰہ عنہ رَجُلاً عَلٰى حَوَائِجِ النَّاسِ۔ رواہ أبو داؤد، والترمذی

حضرت ابومریمؓ الازدی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ سے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''کوئی مسلمانوں کے معاملات کا والی بنایا جائے اور وہ اپنی رعایا کی ضروریات، دوستی اور تنگدستی کے درمیان آڑ پیدا کرے تو اللہ تعالیٰ بھی قیامت کے دن اس کی حاجت، دوستی اور فقر سے پردہ فرمالیں گے۔'' اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو مقرر کردیا کہ وہ عوام کی حاجات کو سنے۔

13- عن أَبِی يَعْلٰى مَعْقَلِ بْنِ يَسَارٍ رضی اللّٰہ عنہ قَالَ: سمعتُ رسولَ اللّٰہ ﷺ يَقولُ ((ما مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيْهِ اللّٰهُ رَعِيَّةً، يَمُوْتُ يَوْمَ يَمُوْتُ وَهُوَ



غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهٖ، إِلاَّ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ)) متفق علیہ۔ وفی رَوایةٍ: ((فَلَمْ يَحُطْهَا بِنُصْحِهٖ لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ)) وفی روایةٍ لِمُسلمٍ ((مَا مِنْ أَمِيرٍ يَلِی أُمُوْرَ الْمُسْلِمِيْنَ ثُمَّ لا يَجْهَدُ لَهُمْ، وَيَنْصَحُ لَهُمْ، إِلاَّ لَمْ يَدْخُلْ مَعَهُمُ الجَنَّةَ))

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ کو فرماتے کہ ''اللہ تعالیٰ جس شخص کو لوگوں پر امیر مقرر کرتا ہے اگر وہ اپنی رعایا کو دھوکہ دیتا ہے اور اس حالت میں فوت ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کردیں گے۔'' اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ''اگر ان کی خیر خواہی کا خیال نہیں رکھتا تو جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔'' امام مسلم کی روایت میں ہے کہ ''جو شخص مسلمانوں کے معاملات کا امیر بنایا جاتا ہے پھر وہ ان کے معاملات کے لئے کوشش نہیں کرتا تو وہ ان کے ساتھ جنت میں نہیں جائے گا۔''

**فائدہ**: امیر بننے سے صرف حقوق نہیں ملتے بلکہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے اور تمام رعایا کی خیر خواہی امیر پر عائد ہوتی ہے۔

14- عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللّٰہ عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعتُ رسولَ اللّٰہِ ﷺ يقولُ: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ، اَلْإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِيْ أَهلِهٖ وَمَسؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فی بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْؤُوْلَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا)) متفق علیہ

حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''تم میں سے ہر کوئی ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ حکمران ذمہ دار ہے اور خلق خدا کے بارے میں مسئول ہے۔ آدمی گھر والوں کا ذمہ دار ہے اور ان کے بارے میں جواب دہ اور عورت اپنے خاوند کے گھر کی ذمہ دار ہے اور اس کے بارے میں جوابدہ ہوگی۔''

15- عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ قال :إِنْ كَانَتِ الْأَمَةُ مِنْ إِمَاءِ الْمَدِيْنَةِ لَتَأْخُذُ بِيَدِالنَّبِيِّ ﷺ ، فَتَنْطَلِقُ بِهٖ حَيْثُ شَائَتْ (رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بعض دفعہ مدینہ منورہ کی کوئی لونڈی آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ لے جاتی جہاں کہیں اسے آپ ﷺ کی مدد کی ضرورت پڑتی۔

**فائدہ**: امام امت تک عوام کی رسائی کا یہ عالم تھا کہ ایک کنیز کو بھی آپؐ کے بارے میں وثوق تھا کہ وہ میری مدد سے انکار نہیں کریں گے۔

16- عن عِيَاضِ بنِ حِمَارٍ رَضِيَ اللّٰہ عنہ قال :قال رسولُ اللّٰہ ﷺ ((إِنَّ اللّٰهَ أَوْحٰى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوْا حَتّٰى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ، وَلَا يَبْغِيَ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ)) رواہ مسلم

حضرت عیاض رضی اللہ عنہ بن حمار بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی بھیجی ہے کہ تواضع اختیار کی جائے یہاں تک کہ کوئی آدمی کسی دوسرے پر فخر نہ کرے اور نہ ہی ایک دوسرے پر سرکشی کرے۔''

**فائدہ**: امراء کو فخر اور خود پسندی سے بچنا چاہئے اور رفقاء کے ساتھ باہم مل جل کر رہنا چاہئے۔

17- عَنْ عِيَاضِ بنِ حِمارٍ رضِی اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ یقولُ ((أَهْلُ الْجَنَّةِ ثَلَاثَةٌ :ذُوسُلْطَانٍ مُقْسِطٌ مُوَفَّقٌ ، وَرَجُلٌ رَحِيمٌ رَقِيقُ الْقَلْبِ لِكُلِّ ذِي قُرْبٰى وَمُسْلِمٍ، وعَفِيْفٌ مُتَعَفِّفٌ ذُوعِيَالٍ)) رواہ مسلم

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''تین قسم کے لوگ جنت والے ہیں۔حکمران عادل ونرم مزاج۔انسان جومہربان اور دل کی نرمی والا ہو، ہر قرابت دار اور مسلمان کے لئے' اور ہر وہ عیال دار جولوگوں سے پیچھے پڑ کر مانگنے والا نہ ہو اور برداشت کرنے والا ہو۔''



18- عَن عَائِذِبْنِ عَمْرٍو رَضی اللّٰہ عنہ أَنَّهُ دَخَلَ عَلٰى عُبِيدِ اللّٰهِ بن زِيَادٍ، فَقَالَ لَہ :أَيْ بُنَيَّ إِنِّي سَمِعْتُ رسولَ اللّٰہ ﷺ یقولُ :((إِنَّ شَرَّ الرِّعَاءِ الْحُطَمَةُ )) فإِيَّاكَ أَن تكُوْنَ مِنْهُمْ متفق علیہ

حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ عبیداللہ بن زیاد (والی کوفہ) کے ہاں گئے اور اسے کہا اے بچے میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''بُرا حاکم وہ ہے جولوگوں پر سختی کرے۔'' تو تم اپنے آپ کو بُرے حاکموں میں سے ہونے سے بچاؤ۔

19- وعَن اَبی مَرِيمَ الْأَزْدِيّ رضی اللّٰہ عنہ ، أَنَّهٗ قَالَ لِمُعاوِيَةَ رضی اللّٰہ عنہ: سَمِعتُ رسولَ اللّٰہ ﷺ یقولُ ((إِنَّ شَرَّ الرِّعَاءِ الْحُطَمَةُ )) فإِيَّاكَ أَنْ تَكُوْنَ مِنْهُمْ ۔متفق علیہ

حضرت ابومریم الازدی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''حاکموں میں سے بُرا وہ ہے جو رعایا پر سختی کرے۔'' پس تم اپنے آپکو انمیں سے ہونے سے بچاؤ۔''

20- عَن عائشةَ رضی اللّٰہ عنھا قَالَتْ سَمِعْتُ رسولَ اللّٰہ ﷺ يَقُوْلُ فِي بَيْتِي هٰذا ((اَللّٰهُمَّ مَنْ وَّلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِيْ شَيْئاً فَشَقَّ عَلَيْهِمْ فَاشْقُقْ عَلَيْهِ، وَمَنْ وَّلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِيْ شَيْئاً فَرَفَقَ بِهِم ، فَارْفُقْ بِهٖ)) رواہ مسلم

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس اپنے گھر میں فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''اے اللہ! جو کوئی میری امت کے معاملات کا نگران بنایا جائے اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی فرما اور جو ان سے نرمی کا برتاؤ کرے تو تو بھی اس سے نرمی برت۔''

---

# مامورین کی ذمہ داریاں

## بَابُ وَجُوْبِ طَاعَةِ وَلَاةِ الْاُمُوْرِ فِیْ غَیْرِ مَعْصِیَةٍ
## وَتَحْرِیْمُ طَاعَتِهِمْ فِی الْمَعْصِیَةِ

**قال اللّٰهُ تعالی ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء:۵۹)**

**21- عَن عبدالرحمنِ بْنِ اَبان بنِ عثمانَ عَن اَبِیهِ اَنَّ زَیْدَ بْنَ ثَابِتٍ رضی اللّٰه عنه خَرَجَ مِنْ عِنْدِ مَرْوَانَ نَحْوًا مِنْ نِصْفِ النَّهارِ، فَقُلْنَا مَابَعَثَ اِلَیْهِ السَّاعَةَ اِلَّا لِشَیْءٍ سَاَلَهُ عَنْهُ، فَقُمْتُ اِلَیْهِ فَسَاَلْتُهُ فَقَالَ اَجَلْ سَاَلَنَا عَنْ اَشْیَاءٍ سَمِعْتُهَا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ.. سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰه ﷺ یَقُوْلُ: "نَضَّرَ اللّٰهُ اِمْرَءًا سَمِعَ مِنَّا حَدِیْثًا فَحَفِظَهُ حَتّٰی یُبَلِّغَهُ غَیْرَهُ فَاِنَّهُ رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ لَیْسَ بِفَقِیْهٍ، وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰی مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ، ثَلَاثُ خِصَالٍ لَایُغَلُّ عَلَیْهِنَّ قَلْبُ مُسْلِمٍ اَبَدًا، اِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ وَمُنَاصِحَةُ وُلَاةِ الْاَمْرِ وَلُزُوْمُ الْجَمَاعَةِ)) أخرجه أحمد**

حضرت عبدالرحمٰن بن ابان اپنے باپ سے سن کر بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نصف النہار کے قریب مروان کے ہاں سے باہر آئے۔ہم نے سوچا ضرور کوئی معاملہ ہے جو اس نے ان سے پوچھا ہوگا۔تو میں ان کے پاس گیا۔اس پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں اس نے ہم سے پوچھا تھا اس چیز کے بارے میں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سن رکھی تھی کہ ''اللہ تعالیٰ اُس شخص کو شاداب کرے جو ہم سے بات سنے اور اسے محفوظ کرلے اور پھر اسے کسی دوسرے آدمی تک پہنچا دے، کیونکہ بعض اوقات بات سننے والا زیادہ سمجھ دار نہیں ہوتا اور بعض اوقات وہ اپنے سے زیادہ سمجھ دار کو بات پہنچا دیتا ہے''۔اور وہ بات یہ تھی کہ



''تین باتوں سے بندہ ٔ مسلم کا دل کبھی خیانت نہیں کرسکتا۔اعمال کا خالص اللہ کے لئے کرنا، صاحب اختیار کی خیر خواہی چاہنا اور جماعت کا التزام۔

**22- عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ مَسْعُودٍ رَضی اللّٰهُ عنه قال :قال رسولُ اللّٰهِ ﷺ ((اِنَّهَا سَتَكُونُ بَعْدِی اَثَرَةٌ، وَاُمُورٌ تُنكِرُونَهَا)) قالوا یا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَیْفَ تَاْمُرُ مَنْ اَدْرَكَ مِنَّا ذٰلِكَ؟ قَالَ ((تُؤَدُّونَ الحَقَّ الَّذِی عَلَیْكُمْ، وَتَسْاَلُونَ اللّٰهَ الَّذِیْ لَكُمْ)) متفق علیه**

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''بیشک میرے بعد تم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے گی اور ایسے معاملات ہوں گے جن کو تم ناپسند کرو گے۔'' صحابہ نے پوچھا ''آپ کیا حکم دیتے ہیں اگر ہمارے سامنے یہ حالات پیدا ہو جائیں۔'' اس پر آپؐ نے فرمایا ''تم پر لازم ہے کہ جو حق تم پر عائد ہوتا ہے اسے ادا کرو اور اپنے حقوق کے بارے میں اللہ سے دعا کرتے رہو۔''

**23- عن أبی هُنَیْدَةَ وائِلِ بن حُجْرٍ رضیَ اللّٰه عنه قالَ :سَأَلَ سَلَمَةُ بنُ یَزِیدَ الجُعْفِیُّ رَسُوْلَ اللّٰه ﷺ فَقَالَ یَا نَبِیَّ اللّٰه أرَأَیتَ اِنْ قَامَتْ عَلَیْنَا اُمَرَاءُ یَسْئَالُوْنَا حَقَّهُمْ وَیَمْنَعُوْنَا حَقَّنَا، فَمَا تَاْمُرُنَا؟ فَأَعْرَضَ عنه، ثُمَّ سَأَلَهُ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ((اِسْمَعُوْا وَأَطِیْعُوْا، فَاِنَّمَا عَلَیْهِمْ مَا حُمِّلُوا، وَعَلَیْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ)) رواه مسلم**

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سلمہ بن یزید الجعفی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ اگر ہم پر ایسے امیر مقرر ہو جائیں جو ہم سے اپنے حق مانگیں لیکن ہم کو ہمارا حق نہ دیں تو ہم کیا کریں؟ آپؐ نے بے رخی اختیار کی۔انہوں نے پھر پوچھا۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سنو اور اطاعت کرو۔بے شک تمہارے ذمہ ہے جو تم پر عائد ہوتا ہے اور ان کے ذمہ ہے جو ان کی ذمہ داری ہے۔''

24- عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللّٰه عنه قال :كُنَّا إِذَا بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا ((فِيمَا اسْتَطَعْتُمْ)) متفق عليه

حضرت عبداللہؓ بن عمر فرماتے ہیں کہ ہم جب بھی نبی اکرم ﷺ سے بیعت سمع و طاعت کرتے تو آپؐ فرماتے ''جس میں تم استطاعت رکھتے ہو۔''

25- وعنهُ قال سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يقول :((مَنْ خَلَعَ يَداً مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا حُجَّةَ لَهُ ، وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً (رواه مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ''جو شخص بیعت کرنے کے بعد اطاعت اختیار نہ کرے تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی عذر پیش کرنے کے قابل نہ ہوگا اور جو اس حال میں مر گیا کہ اُس نے بیعت نہ کی تو گویا وہ تو جاہلیت کی موت مرا۔''

26- عَنْ أَبِى هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ((عَلَيْكَ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِى عُسْرِكَ وَيُسْرِكَ وَمَنْشَطِكَ وَمَكْرَهِكَ وَأَثَرَةٍ عَلَيْكَ)) رواه مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''تیرے ذمہ ہے سننا اور اطاعت کرنا تنگی میں بھی اور آسانی میں بھی، دل کی آمادگی کی حالت میں بھی اور ناپسندیدگی کی حالت میں بھی، خواہ تجھ پر کسی کو ترجیح دے دی جائے۔''

27- عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضى اللّٰه عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قال ((عَلى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيْمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ، إِلَّا أَنْ يُؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ)) متفق عليه

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''ایک بندۂ مسلم پر لازم ہے (امیر کا حکم) سننا اور ماننا ہر معاملہ میں، خواہ اسے پسند ہو یا



ناپسند، سوائے اس کے کہ اسے کسی نافرمانی کا حکم دیا جائے۔ جب کسی نافرمانی والے کام کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ اطاعت کرنا۔''

28- عَن عَوفِ بن مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰه عنه قال :سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يقولُ ((خِيَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَكُمْ، وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ، وَشِرَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُم وَيُبْغِضُونَكُمْ ، وَتَلْعَنُوْنَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ)) قَالَ :قُلْنا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ، أَفَلَا نُنَابِذُهُمْ؟ قَالَ:((لَا مَا أَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلَاةَ، لَا، مَا أَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلَاةَ)) رواه مسلم

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''تمہارے بہترین حاکم وہ ہوں گے جن سے تم محبت کرو گے اور وہ تم سے محبت رکھیں گے۔ تم ان کے لئے رحمت کی دُعا کرو گے اور وہ تم پر مہربان ہوں گے۔ اور تمہارے بُرے امراء وہ ہوں گے کہ جن سے تم بغض رکھو گے اور وہ تم سے بغض رکھیں گے۔ جن پر تم لعنت بھیجو گے اور وہ تم پر لعنت برسائیں گے۔'' راوی کہتے ہیں کہ ہم نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول کیا ہم ایسے حکمرانوں کو اتار نہ پھینکیں؟ آپؐ نے فرمایا ''نہیں، جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز کا نظام قائم رکھیں۔''

29- عَنْ أَبِى هُرَيرَةَ رضى اللّٰه عنه قَال قَال رسولُ اللّٰه ﷺ ((كَانَتْ بَنُو إِسرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ، وَسَيَكُوْنُ بَعْدِيْ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُوْنَ)) قَالُوا يَا رَسُوْلَ اللّٰه فَمَا يَأْمُرُنَا؟ قَالَ :((أَوْفُوا بِبَيْعَةِ الْأَوَّلِ فَالْأَوَّلِ، ثُمَّ أَعْطُوْهُمْ حَقَّهُمْ، وَاسْأَلُوا اللّٰهَ الَّذِيْ لَكُمْ، فَإِنَّ اللّٰهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ)) متفق عليه

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کرتے تھے۔ جب کوئی نبی فوت ہو جاتا تھا تو دوسرا

اس کی جگہ لے لیتا تھا۔ لیکن اب میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ میرے بعد خلفاء ہوں گے اور وہ بہت سے ہوں گے۔'' صحابہ نے عرض کی آپ ان کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا'' پہلے کی بیعت کا حق ادا کرو، پھر ان کے حقوق ادا کرو اور اپنے حقوق کے بارے میں اللہ سے دعا کرتے رہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن سے پوچھے گا ان کے بارے میں جو ان کی رعیت ہوگی۔''

---

# رفقاء کے ساتھ تعلق/ اخلاقیات

30- عَنْ أَنَسٍ رضی اللّٰہ عنه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلَّم: ''مَنْ نَصَرَ أَخَاهُ بِالْغَيْبِ نَصَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ'' (رواہ البیهقی فی الشُعْبِ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ'' جو آدمی اپنے کسی بھائی کی غیر حاضری میں اس کی مدد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دنیا اور آخرت میں مدد فرماتے ہیں۔'''

31- عَنْ عبدِاللّٰه بنِ عَمْرٍو رضی اللّٰه عنه قَالَ قَالَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ ((اِرْحَمُوا تُرْحَمُوا، وَاغْفِرُوْا يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ، وَوَيْلٌ لِأَقْمَاعِ الْقَوْلِ، وَوَيْلٌ لِلْمُصِرِّيْنَ الَّذِيْنَ يُصِرُّوْنَ عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ)) (رواہ البخاری فی الأدب المفرد)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنھما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' تم آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرو تم پر رحم کیا جائے گا۔ ایک دوسرے کو معاف کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری بھی مغفرت فرمائیں گے۔ اور ہلاکت ہے بات سن کر مدد نہ کرنے والے پر، اور ہلاکت ہے اپنے بُرے کاموں پر اصرار کرنے والوں پر جب کہ وہ جان



رہے ہوں کہ یہ بُرے ہیں۔''

32- وعَن أَبی هُریرة رضی اللّٰه عنه أَنَّ رَجُلًا قالَ يَا رسولَ اللّٰه ﷺ إِنَّ لِيْ قَرَابَةً أَصِلُهُمْ وَيَقْطَعُوْنِي، وَأُحْسِنُ إِلَيْهِمْ وَيَسِيْئُوْنَ إِلَيَّ، وَأَحْلُمُ عَنْهم وَيَجْهَلُوْنَ عَلَيَّ، فقال: ((لَئِن كُنْتَ كَمَا قُلْتَ فَكَأَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ وَلَا يَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللّٰه تَعَالٰى ظَهِيرٌ عَلَيهِمْ مَادُمْتَ عَلٰى ذٰلِكَ)) (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ میرے قرابت دار ہیں۔ میں اُن سے صلہ رحمی کرتا ہوں وہ قطع رحمی پر تلے ہوئے ہیں۔ میں اُن سے بھلائی کرتا ہوں لیکن وہ بُرائی سے پیش آتے ہیں۔ میں اُن سے درگذر کرتا ہوں وہ میرے ساتھ اکھڑ پن برتتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا ''اگر واقعی تو ویسا ہے جیسا تو نے بیان کیا ہے تو گویا تو اُن پر آگ کے گولے پھینک رہا ہے اور اللہ کی طرف سے تیرا مددگار مقرر ہے جب تک تو ایسا ہے۔''

33- و عَنْ أنسٍ رضی اللّٰه عنه قَالَ: كُنتُ أَمْشِي مَعَ رَسولِ اللّٰه ﷺ وَعَلَيهِ بُرْدٌ نَجْرَانِيٌّ غَلِيْظُ الْحَاشِيَةِ فَأَدْرَكَهُ أَعْرَابِيٌّ فَجَبَذَهُ بِرِدَائِهِ جَبْذَةً شَدِيْدَةً، فَنَظَرْتُ إِلٰى صَفحَةِ عَاتِقِ النَّبِيِّ ﷺ وَقَدْ أَثَّرَتْ بِهَا حَاشِيَةُ الرِّدَاءِ مِنْ شِدَّةِ جَبْذَتِهٖ، ثُمَّ قال: يَا مُحَمَّدُ مُرْلِيْ مِن مَالِ اللّٰهِ الَّذِيْ عِنْدَكَ۔ فَالْتَفَتَ إِلَيْهِ، فَضَحِكَ ثُمَّ أَمَرَ لَهُ بِعَطَاءٍ۔ متفق علیه

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جا رہا تھا اور آپ نے نجرانی چادر اوڑھی ہوئی تھی جس کا حاشیہ بہت گاڑھا تھا تو ایک دیہاتی نے آپؐ کی چادر پکڑ کر بہت زور سے کھینچا۔ میں نے آپؐ کے کندھے پر نشان دیکھا اس کے شدت سے کھینچنے کی وجہ سے۔ پھر اس نے کہا اے محمدؐ میرے لئے حکم دو اس اللہ کے مال میں سے جو آپؐ کے پاس ہے۔ آپؐ نے اس کی طرف توجہ کی اور ہنس دیئے،

پھر اُسے کچھ دینے کا حکم فرمایا۔

34- و عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللّٰہ عنه قَال :قَال رَسولُ اللّٰه ﷺ ((أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِمَنْ يَّحْرُمُ عَلَى النَّارِ" أَوْ بِمَنْ تَحْرُمُ عَلَيْهِ النَّارُ؟ تَحْرُمُ عَلٰى كُلِّ قَرِيْبٍ هَيِّنٍ لَيِّنٍ سَهْلٍ))۔ رواه الترمذی وقال حدیث حسنٌ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ ''میں تم کو آگاہ نہ کروں کہ کس کے لئے دوزخ حرام ہے؟ دوزخ حرام ہے ہر اُس (مسلمان) پر جو دوسروں کے ساتھ قربت رکھنے والا ہو، اُس تک رسائی آسان ہو، وہ دوسروں سے نرم رویہ رکھنے والا ہو، وہ آسانی سے دستیاب ہو۔''

35- و عن عائشةَ رضی اللّٰه عنها قَالَتْ :مَا خُيِّرَ رَسُوْلُ اللّٰه ﷺ بَيْنَ أَمْرَيْنِ قَطُّ إِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَ هُمَا، مَا لَمْ يَكُنْ إِثماً ، فإن كَانَ إِثماً، كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ وَمَا انْتَقَمَ رسولُ اللّٰه ﷺ لِنَفْسِهِ فی شَیْءٍ قَطُّ، إِلَّا أَن يُنْتَهَكَ حُرْمَةُ اللّٰهِ، فَيَنتَقِمَ لِلّٰه تَعالٰی ۔ متفق علیه

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب دو اُمور میں اختیار کا معاملہ ہوتا تو آپ آسان کو پسند فرماتے جب تک کہ گناہ کا معاملہ نہ ہوتا۔ اگر گناہ کی بات ہوتی تو آپ اس سے سب سے زیادہ دور رہتے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات پر زیادتی پر کبھی انتقام نہیں لیا سوائے اس کے کہ کسی کو اللہ کی حرام کردہ چیز سے روکنا مطلوب ہو۔ اگر اللہ کی حرمت کا معاملہ ہوتا تو آپ ضرور انتقام لیتے۔

36- وعَن جَرِيْرِ بنِ عَبدِاللّٰه رضی اللّٰه عنه قال :سمعتُ رسول اللّٰه ﷺ يَقُوْلُ :((مَنْ يُحْرَمَ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الخَيْرَ كُلَّهُ))۔ رواه مسلم

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''جو نرم دلی سے محروم کر دیا گیا وہ تو گویا کل خیر سے محروم کر دیا



گیا۔''

37- وعَن عَائشةَ رضی اللّٰه عنها قالت :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰه ﷺ ((إِنَّ اللّٰهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْأَمْرِ كُلِّهِ))۔ متفق علیه

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''بے شک اللہ تعالیٰ مہربان ہے اور وہ مہربانی یا نرم برتاؤ کو پسند فرماتا ہے تمام معاملات میں۔''

**فائدہ :**

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

38- و عَن عَائشةَ رضیَ اللّٰهُ عَنْها ، قَالَت :سَمِعتُ رسولَ اللّٰه ﷺ يقُولُ: ((إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكَ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ))۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنا فرماتی ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''بندہ مؤمن اپنے اچھے اخلاق کی بدولت وہ درجہ پالیتا ہے جو بہت روزے رکھنے والے اور اکثر قیام اللیل کرنے والے کا ہے۔'' (رواہ ابوداؤد)

39- و عَن أَبی الدَّرداءِ رضی اللّٰه عنه :أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ ((مَا مِنْ شَیءٍ أَثْقَلُ فِی ميزَانِ الْمُؤْمِنِ يومَ القِيَامَةِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ، وإِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ الفَاحِشَ البَذِیَّ)) (رواه الترمذی )

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''حسن اخلاق سے بڑھ کر کوئی وزنی عمل نہیں ہوگا جو قیامت کے دن میزان میں تلے گا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہوتی ہے فحش گوئی اور بکواس کرنے والے پر۔''

40- وعَنِ الصَّعْبِ بْنِ جَثَّامَةَ رضیَ اللّٰه عنه قال :أَهْدَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ حِمَاراً وَحْشِيّاً، فَرَدَّهُ عَلَيَّ، فَلَمَّا رَأٰى مَافِی وَجْهِی قالَ ((إِنَّا لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيْكَ إِلَّا أَنَّا حُرُمٌ)) (متفق علیه)

حضرت الصعب بن جثامہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک جنگلی گدھا پیش کیا تو آپ نے میرا ہدیہ قبول نہیں کیا۔ جب آپ نے میرے چہرے پر ناگواری محسوس کی تو وضاحت فرما دی کہ ''ہم نے اس لئے قبول نہیں کیا کہ ہم احرام کی حالت میں ہیں۔''

41- وعَنِ النَّواسِ بْنِ سَمْعَانَ رضيَ اللّٰهُ عنه قال :سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنِ البِرِّ والْإِثْمِ فقالَ :((اَلْبِرُّ حُسْنُ الخُلُقِ، وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فی نَفْسِكَ، وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ)) رواه مسلم

حضرت النواس بن سمعان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ نیکی اور گناہ کے بارے میں وضاحت فرما دیں تو آپؐ نے فرمایا ''نیکی اچھا اخلاق ہے اور بُرائی وہ ہے جو تیرے کے سینے میں تردد پیدا کرے اور تو ناپسند کرے کہ لوگ اسے جانیں۔''

**فائدہ** : معروف ومنکر۔ نیکی اور برائی کی تمیز اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی میں سمو دی ہے، اس لئے کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اپنے نفس سے پوچھ لے کہ وہ اس پر خوش ہے تو نیکی ہے وگرنہ برائی۔

42- وعن ابی هريرة رضی الله عنه قال قالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ((ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ القِيَامَةِ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ :شَيْخٌ زانٍ، وَمَلِكٌ كَذَّابٌ ، وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ )) رواه مسلم
((العَائِلُ)) الفَقِيرُ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''تین قسم کے لوگوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کلام نہیں فرمائیں گے اور نہ ہی اُن کا تزکیہ کریں گے اور نہ ہی اُن کی طرف التفات فرمائیں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ بوڑھا زانی، جھوٹا بادشاہ اور بھوکا متکبر۔''



**فائدہ** : انسان اگر اس حالت میں بھی خود کو نہ پہچانے تو کتنی بے بضاعتی ہے۔ بوڑھا ہوگیا ہے پھر زنا جیسی حرکت سے باز نہیں آتا۔ اللہ نے سرداری عطا کی ہے لیکن پھر بھی لوگوں کو جھوٹ بول کر دھوکا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ناداری کی حالت میں رکھا ہے لیکن گردن اکڑی ہوئی ہے اور مالک کے سامنے عاجزی اختیار نہیں کرتا۔

43- و عَن أَبی هُريرة رضی الله عنه أنَّ رسولَ اللّٰهِ ﷺ قال :(لا يَنْظُرُ اللّٰهُ يَوْمَ القِيَامَةِ إِلٰى مَنْ جَرَّ إِزَارَهُ بَطَراً )) متفق عليه

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کی طرف (رحمت سے) نہیں دیکھے گا جس کا تہبند/ پاجامہ وغیرہ لٹک رہا ہوگا فخر کی وجہ سے۔''

**فائدہ** : اللہ تعالیٰ مَردوں کے لئے پسند فرماتا ہے کہ وہ لباس ستر اور زینت کے لئے اختیار کریں لیکن اسراف سے بچیں اور نہ ہی لباس سے فخر کا اظہار ہو اور ٹخنوں سے نیچے لباس کا لے جانا تکبر کی نشانی ہے۔

44- وَ عَن أَبی سعيدٍ الخُدريِّ رضيَ اللّٰهُ عنه، عنِ النبيِّ ﷺ قَالَ ((احْتَجَّتِ الجَنَّةُ والنَّارُ، فقالتِ النَّارُ :فِيَّ الْجَبَّارُونَ وَالْمُتَكَبِّرُونَ، وقَالَتِ الْجَنَّةُ :فِيَّ ضُعَفَاءُ النَّاسِ وَمَسَاكِينُهُمْ، فَقَضَى اللّٰهُ بَيْنَهُمَا :إِنَّكِ الْجَنَّةُ رَحْمَتِي، أَرْحَمُ بِكِ مَنْ أَشَاءُ، وَإِنَّكِ النَّارُ عَذَابِی أُعَذِّبُ بِكِ مَنْ أَشَاءُ، وَلِكِلَيْكُما عَلَيَّ مِلْؤُها)) رواه مسلم

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''جنت اور دوزخ کا باہم مکالمہ ہوگیا تو دوزخ کہنے لگی میرے اندر بڑے بڑے جابر اور متکبر انسان ہیں۔ اس پر جنت نے کہا میرے پاس تو انسانوں میں سے کمزور اور مساکین ہیں، جو تواضع اختیار کرنے والے اور زہد اختیار کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان فیصلہ یوں فرمایا کہ اے جنت تو میری رحمت ہے، میں تیرے ذریعہ سے

جسے چاہوں گا رحمت سے سرفراز کروں گا اور اے دوزخ تو میرا عذاب ہے، میں تیرے ذریعہ سے جسے چاہوں گا عذاب دوں گا۔تم دونوں کا بھرنا میرے ذمہ ہے۔''

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے انسان کو عبد کی حیثیت میں پیدا فرمایا ہے اور اس سے مطالبہ بھی فرمانبرداری کا ہے۔ اس لئے جو بھی کبر وغرور سے اپنے آپ کو بچائے گا وہ اللہ کی رحمت کو پالے گا۔کیونکہ وہ اپنی زمین میں کسی انسان کی بڑائی اور فساد کو پسند نہیں کرتا۔ جو غلام ہوتے ہوئے بھی بڑا بننے کی کوشش کرے گا تو عذاب کا مستحق ہوجائے گا۔

45- عَنْ هِشامِ بْنِ عَامِرٍ رضی اللّٰه عنه قال سَمِعْتُ رسولَ اللّٰه ﷺ يَقُوْلُ لا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ مُسْلِماً فَوْقَ ثَلَاثٍ، فَإِنَّهُمَا نَاكِبَانِ عَنِ الْحَقِّ مَادَامَا عَلٰى صُرَامِهِمَا، فَأَوَّلُهُمَا فَيْئًا، سَبْقُهُ بِالْفَيْءِ كَفَارَةً، فَإِنْ سَلَّمَ وَلَمْ يُرَدَّ عَلَيْهِ سَلَامَهُ رَدَّتْ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ وَرَدَّ عَلَى الْآخَرِ الشَّيْطَانُ فَإِنْ مَاتَا عَلٰى صُرَامِهِمَا لَمْ يَجْتَمِعَا فِيْ الْجَنَّةِ اَبَدًا (أخرجه البخاری فی الأدب المفرد، وأحمد والبیهقی فی الشعب)

حضرت ہشام بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے''کہ کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان سے تین دن سے زائد علیحدہ (ناراض) رہے۔کیونکہ اگر وہ ایسا کریں تو وہ حق سے روگردانی کے مرتکب ہوں گے۔ان میں سے جو پہلے لوٹے گا تو اس کا پہلے لوٹنا کفارہ بن جائے گا۔اگر وہ سلام کرے اور اس کو جواب نہ دیا جائے تو فرشتے اسے جواب دیتے ہیں اور دوسرے کو شیطان جواب دیتا ہے۔اور اگر اسی ناراضگی پر وہ مرجائیں تو جنت میں کبھی بھی اکٹھے نہ ہو پائیں گے۔''

46- عن عمران بن حَصِيْنٍ وأبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللّٰه عنه قالاَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ((إِنَّ اللّٰهَ إِذَا أَنْعَمَ عَلَى عَبْدٍ نِعْمَةً يُحِبُّ أَنْ يُرَى أَثْرَ نِعْمَتِهِ عَلٰى عَبْدِهِ))۔ رواه ابن سعد و ابن حبان



حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ''اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کو کسی نعمت سے نوازتے ہیں تو اس نعمت کا اثر اس پر دیکھنا پسند کرتے ہیں۔''

47- عَنْ أَبِی بَكْرَةَ رضی اللّٰه عنه قَال قَال رسولُ اللّٰه ﷺ: ''مَا مِنْ ذَنْبٍ أَجْدَرُ أَنْ يُعَجِّلَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِصَاحِبِهِ الْعَقُوبَةُ فِي الدُّنْيَا مَعَ مَا يُدَخِّرُ لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْبَغْيِ وَقَطِيعَةِ الرَّحِمِ)) و قد روى الحديث بزيادة وهو ((مَا مِنْ ذَنْبٍ أَجْدَرُ أَنْ يُعَجِّلَ اللّٰهُ لِصَاحِبِهِ الْعُقُوْبَةَ عَلٰى مَا يُدَخِّرُ لَهُ فی الآخرَةِ مِنْ قَطِيعَةِ الرَّحِمِ وَالْخِيَانِةِ وَالْكَذِبِ وَإِنَّ أَعْجَلَ الْبِرِّ ثَوَاباً لِصِلَةِ الرَّحِمِ حتّٰى اِنَّ اَهْلَ الْبَيْتِ لِيَكُوْنُوا فُقَرَاءَ فَتَنَمُّوْا اَمْوَالَهُمْ وَيَكْثُرُ عَدَدَهُمْ إِذَا تَوَاصَلُوا)) رواه الطبرانی

حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ دنیا میں جلد پکڑ فرماتا ہے، آخرت کے عذاب کے علاوہ، وہ سرکشی اور قطع رحمی ہے۔'' اور ایک حدیث میں یہ زیادہ بیان ہوا ہے کہ ''قطع رحمی کے ساتھ خیانت اور جھوٹ پر بھی گرفت جلد ہوتی ہے اور نیکیوں میں جلد اجر میں صلہ رحمی سب سے بڑھ کر ہے، جب کہ اگر کسی گھر والے فقیر ہوں اور ان کی تعداد بھی کم ہو تو صلہ رحمی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ان کے مال واولاد میں برکت ڈال دیتا ہے۔''

48- عَنْ أَنَس بن مالك رضی اللّٰه عنه قال قالَ رسولُ اللّٰه ﷺ: ((إِذَا تَزَوَّجَ الْعَبْدُ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ نِصْفَ الدِّيْنَ، فَلْيَتَّقِ اللّٰه فِيْمَا بَقِیَ)) اخرجه الطبرانی فی المعجم الأوسط

حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ کا بندہ جب شادی کر لیتا ہے تو آدھا ایمان مکمل کر لیتا ہے، پس اب باقی آدھے میں اللہ کا تقویٰ اختیار کیئے رکھنا چاہئے۔''

49- عَن أَبی هریرة رضی اللّٰه عنه اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللّٰه علیه وسلّم قال: ((ثَلَاثُ دَعْوَاتٌ مُسْتَجَابَاتٌ لَا شَكَّ فِیْهِنَّ: دَعْوَةُ الْوَالِدِ، وَدَعْوَةُ الْمُسَافِرِ وَدَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ)) اخرجه البخاری فی الأدب المفرد، و ابو داؤد والترمذی، وابن ماجه، وابن حبابن، والطیالسی، وأحمد۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''تین دعائیں بے شک قبول ہوتی ہیں، والد کی دعا (اولاد کے حق میں)، مسافر کی دعا (اپنے اور دوسروں کے حق میں) اور مظلوم کی دعا (ظالم کے خلاف)۔

50- عَنْ حُذیفةَ رضی اللّٰه عنه قَالَ قَالَ رسولُ اللّٰه ﷺ: ''إنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا لَقِیَ الْمُؤْمِنَ فَسَلَّمَ عَلَیْهِ، وَأَخَذَ بِیَدِهِ فَصَافَحَهُ تَنَاثَرَتْ خَطَایَاهُمَا كَمَا یَتَنَاثَرُ وَرَقَ الشَّجَرِ)) ذكره المنذری فی الترغیب

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی بندۂ مومن کسی دوسرے مومن سے ملاقات کرتا ہے اور اس کو سلام کہتا ہے، اس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرتا ہے تو ان دونوں کے گناہ جھڑ جاتے ہیں جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔''

51- عن عبداللّٰه بن عمر رضی اللّٰه عنه أنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِیِّ ﷺ أيُّ الْمُؤْمِنِیْنَ أَفْضَلُ وَأَیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ اَكْیَسُ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ((أَفْضَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ أَحْسَنُهُمْ خُلُقاً، وأَكْیَسُهُمْ أَكْثَرُهُمْ لِلْمَوْتِ ذِكْرًا وَأَحْسَنُهُمْ لَهُ اسْتِعْدَادًا، أُولٰئِكَ الْأَكْیَاسُ))۔(رواه البیهقی فی الزهد الكبیر)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی کہ کون سا مومن سب سے افضل ہے اور کون سا مومن سب سے زیادہ عقل مند ہے؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مومنوں میں سے افضل ترین مومن وہ ہے جو سب سے زیادہ اچھے اخلاق والا ہو اور سب سے عقلمند وہ ہے جو موت کو سب



سے زیادہ یاد رکھنے والا ہو اور سب سے زیادہ موت کے لئے تیاری کرنے والا سب سے زیادہ عقل والا ہے۔''

52- عَن وَكیعِ بْن عُدُسٍ عَنْ عَمِّهِ أَبِي رَزِیْنٍ قالَ قالَ رسولُ اللّٰه ﷺ: ''مَثَلُ الْمُؤْمِنِ مَثَلُ النَّحْلَةِ، لَا تَأْكُلُ إِلَّا طَیِّباً، وَلَا تَضَعُ إِلَّا طَیِّباً)) ( أخرجه ابن حبان، وابن عساکر)

حضرت وکیع بن عدس اپنے چچا ابورزین سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مومن کی مثال تو شہد کی مکھی کی طرح ہے کہ وہ پاکیزہ چیز کھاتی ہے اور پاک چیز ہی اگلتی ہے۔''

53- عَنْ عُمَرَؓ قَالَ كَانَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یُعْطِیْنِی الْعَطَاءَ فَاَقُوْلُ اَعْطِهِ مَنْ هُوَ اَفْقَرُ اِلَیْهِ مِنِّیْ فَقَالَ خُذْهُ اِذَا جَاءَكَ مِنْ هٰذَا الْمَالِ شَیْئٌ وَاَنْتَ غَیْرُ مُشْرِفٍ وَلَا سَائِلٍ فَخُذْهُ فَتَمَوَّلْهُ اِنْ شِئْتَ كُلْهُ وَاِنْ شِئْتَ تَصَدَّقْ بِهٖ وَمَا لَا فَلَا تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ قَالَ سَالِمٌ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فَكَانَ عَبْدُاللّٰهِ لَا یَسْئَلُ اَحَدًا شَیْئًا وَلَا یَرُدُّ شَیْئًا اَعْطِیَهٗ۔ متفق علیه

حضرت عمرؓ سے عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ مجھے ہدیہ دیا کرتے تھے۔ میں عرض کرتا اس شخص کو دیجئے جو مجھ سے زیادہ محتاج ہے۔ آپؐ فرماتے لے لو! (یاد رکھو) جب آپ کو ایسا مال ملے جس میں آپ کو لالچ نہ ہو اور نہ ہی آپ نے سوال کیا ہو تو اس کو لے کر اپنے قبضہ میں کرو۔ آپ کو اختیار ہے اس کو کھا لو اور اگر پسند ہو تو صدقہ کر دو اور جو مال اس طرح میسر نہ آئے اس کے پیچھے اپنے آپ کو نہ لگاؤ۔ حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر کسی سے کچھ سوال نہیں کرتے تھے اور جو مال سے دیا جاتا اسے واپس نہ کرتے تھے۔

54- عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ یَوْمٍ یُصْبِحُ الْعِبَادُ فِیْهِ

اِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ فَيَقُوْلُ اَحَدُهُمَا اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَيَقُوْلُ الْاٰخَرُ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا۔ متفق عليه

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو بھی دن انسان پر نکلتا ہے اس میں دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ان میں ایک دعا کرتا ہے کہ اے اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ بخیل کے مال کو برباد کر۔

55- عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا اَنَّهُمْ ذَبَحُوْا شَاةً فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ مَا بَقِيَ مِنْهَا قَالَتْ مَا بَقِيَ مِنْهَا اِلَّا كَتِفُهَا قَالَ بَقِيَ كُلُّهَا غَيْرَ كَتِفِهَا۔ رواه ترمذى

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ انہوں نے ایک بکری ذبح کی (اور اسے غریبوں مسکینوں میں بانٹ دیا) نبی اکرم ﷺ نے پوچھا کہ اس میں سے کیا بچا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا اس کا ایک کندھا بچا ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا وہ تو ساری بچ گئی سوائے بازو کے (کیونکہ وہ ہم کھا جائیں گے)۔

56- عَن أَبى الزبير قال سمعتُ جابراً رضى اللّٰه عنه يقولُ قَالَ رسولُ اللّٰه ﷺ: ((إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ الطَّعَامَ فَلَا يَمْسَحْ يَدَهُ حَتّٰى يَلْعَقَهَا أَوْيُلْعِقَهَا، وَلَا يَرْفَعُ صَحْفَةً حَتّٰى يَلْعَقَهَا أَوْيُلْعِقَهَا، فَإِنَّ آخَرَ الطَّعَامِ فِيْهِ بَرْكَةٌ))۔ أخرجه النسائى

حضرت ابوزبیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اپنے ہاتھ نہ پونچھے جب تک ان کو چاٹ نہ لے اور کوئی کھانے کا برتن نہ اٹھائے جب تک اُسے اچھی طرح چاٹ نہ لے، کیونکہ کھانے کے آخری حصے میں برکت ہوتی ہے۔''

57- عَنْ أبى هُريرةَ رضياللّٰهعنه عنِ النَّبِيِّ ﷺ: ''إِذَا خَرَجْتَ مِنْ مَنْزِلِكَ فَصَلِّ رَكْعَتَيْنِ يَمْنَعَانِكَ مِنْ مَخْرَجِ السُّوْءِ، وَإِذَا دَخَلْتَ إِلٰى مَنْزِلِكَ



فَصَلِّ رَكْعَتَيْنِ يَمْنَعَانِكَ مِنْ مَدْخَلِ السُّوْءِ))۔ (رواه المخلص في حديثه، كَمَافِى المنتقى والبزار فى (المسند))

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر سفر پر جانے والا نکلنے سے پہلے دو رکعت نفل پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ بچاتا ہے سفر کی برائی سے اور جب واپس آئے اور دو رکعت پڑھ لے تو اس کے حضر میں اسے برائی سے بچاتا ہے۔''

58- عَن جَابِرٍ رضى اللّٰه عنه قَالَ قَالَ رسولُ اللّٰه ﷺ: ''لَوْ أَنَّ ابْنَ آدَمَ هَرَبَ مِنْ رِّزْقِهِ كَمَا يَهْرَبُ مِنَ الْمَوْتِ، لَاَدْرَكَهُ رِزْقُهُ كَمَا يُدْرِكُهُ الْمَوْتُ))۔ رواه ابو نعيم فى الحلية

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر آدم کا بیٹا رزق سے بھی اسی طرح بھاگے جیسے موت سے بھاگتا ہے تو رزق بھی اسے اسی طرح ڈھونڈ لے جیسے موت آ لیتی ہے۔''

59- عَنْ أَبى سعيدٍ رضى اللّٰه عنه أُحِبُّوا المَسَاكِيْنَ فَإِنِّيَ سَمِعْتُ رسولَ اللّٰه ﷺ يَقُوْلُ فِي دُعَائِهٖ: ((اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِىْ مِسْكِيْنًا، وَأَمِتْنِى مِسْكِيْنًا، وَاحْشُرْنِىْ فِىْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنَ( أخرجه عبد بن حميد في المنتخب من المسند)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مساکین سے محبت رکھو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپؐ دعا فرماتے تھے: ''اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ اور مسکین کی حالت میں مجھے موت آئے اور مسکینوں کے زمرے میں میرا حشر کیجئے۔''

60- عَنْ أَبِىْ أَيوبِ الأَنصارِيِّ رضياللّٰه عنه قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ عِظْنِىْ وَاَوْجِزْ، فَقَالَ: ''إِذَا قُمْتَ فِى صَلَاتِكَ فَصَلِّ صَلَاةَ مُوَدِّعٍ، وَلَا تُكَلِّمْ بِكَلَامٍ تَعْتَذِرُ مِنْهُ غَدًا، وَاجْمَعِ الْاَيَاسَ مِمَّا فِى أَيْدِى

النَّاسِ))۔ اخرجه ابن ماجه، وأحمد

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی مجھے نصیحت فرمائیے لیکن اختصار کے ساتھ۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ((جب تم نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہو تو سمجھو کہ یہ آخری نماز ہے، اور ایسی بات نہ کرو کہ جس پر کل کو معذرت کرنا پڑے، اور جو لوگوں کے پاس ہے اس سے امید ختم کرلو۔

61- عن ابی هريرة رضی الله عنه قال :قال رسولُ الله ﷺ ((أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيْمَاناً أَحْسَنُهُمْ خُلُقاً، وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ))۔ رواه الترمذی وقال حديث حسن صحيح

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''کہ ایمان کے لحاظ سے سب سے کامل مومن وہ ہے جو بہترین کردار کا حامل ہو اور تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں سے اچھا برتاؤ کرنے والا ہے۔''

62- عن قبيصةَ بن ذؤيب رضی اللّٰهعنه اَنَّ عُمَرَ بْنَ الخطاب رضی اللّٰهعنه أَعْطَی السَّعْدِی ألفَ دِيْنَارٍ فَاَبٰی أَنْ يَّقْبَلَهَا وَقَالَ لَنَا عَنْهَا غِنیً فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ رضی اللّٰه عنه اِنِّیْ قَائِلٌ لَّکَ مَا قَالَ لِیْ رسولُ اللّٰه ﷺ (اخرجه ابن حبان)

حضرت قبیصہ بن ذوئیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے السعدی کو ایک ہزار دینار کا عطیہ دیا۔ انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہیں وہی کہتا ہوں جو مجھے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا (جو چیز بغیر طلب کئے ملے اسے لے لو پھر خواہ خود استعمال کرو یا صدقہ کرو، کیونکہ یہ رزق ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطا ہوتا ہے)۔

☆—☆—☆

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

# منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

# قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

**اسلام کی نشأۃِ ثانیہ -اور- غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہوسکے

**وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ**

---

تنظیمِ اسلامی کا پیغام — نظامِ خلافت کا قیام

# تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

# اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

# دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

# نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**